شبانہ خاتون

خالد سُہیل: فن اور فن کار

[تنقید]

خالد سہیل: فن اور فن کار

شبانہ خاتون

خالد سہیل: فن اور فن کار

[تنقید]

شبانہ خاتون

حلقہ ادب وثقافت
شیخ داموں پورہ، مئوناتھ بھنجن، یو۔پی، ہند

KHALID SOHAIL : FAN AUR FANKAR
[Criticism]
By
SHABANA KHATOON

کتاب	:	خالد سہیل: فن اور فن کار [تنقید]
مصنف و ناشر	:	شبانہ خاتون
اشاعت	:	2013ء
صفحات	:	168
قیمت	:	250/-
تعداد	:	500

زیر اہتمام
حلقۂ ادب و ثقافت ؛ شیخ داموں پورہ، مئوناتھ بھنجن، یوپی

Distributor:
MASOOMA & COMPANY
1590, Rodgran, Lal Kuwan, Delhi -110006
ISBN : 978-81-923712-9-0

رابطہ :
* الہدیٰ پبلی کیشنز، 2982 کوچہ نیل کنٹھ، قاضی واڑہ، دریا گنج، نئی دہلی 2
* انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی 110006
* ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 200202
* مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی - 110006
* مکتبہ صدف، چمرق روڈ، چندواڑہ، مظفرپور-842001

والدین کے نام

جنھوں نے زندگی کے نشیب وفراز کو سمجھنے کا ماحول فراہم کیا

"MY CREATIONS
ARE
MY LOVE LETTERS TO HUMANITY"

[Khalid Sohail]

'میری تخلیقات انسانیت کے نام میرے محبت نامے ہیں'

[خالد سہیل]

خالد سہیل کی ویب سائٹ 'www.drsohail.com' سے ماخوذ

فہرست

پیش لفظ

اردو افسانوی ادب، ہر قدم اور ہر موڑ پر زندگی کا ہمراہی ہے۔ اس نے ہر دور میں ملکی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور انسان کے اندرون میں پرورش پانے والے تصورات و خیالات کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ گاؤں اور دیہات کے اکھرے اور سیدھے سادے مسائل سے لے کر شہری زندگی کی پیچیدگیوں اور اس کے مسائل پر بھی قابل ذکر تخلیقات سامنے آئیں اور فکشن نگاروں نے مخصوص علاقوں کی زندگی، رہن سہن، طرز بود و باش اور مسائل حیات و کائنات کا حقیقت پسندانہ بیان کیا۔

موجودہ دور میں اردو ادب ملک کی سرحدوں سے نکل کر نئی زمینیں اور وسعتیں تلاش کر رہا ہے۔ اب ایسے بہت سے اردو قلم کار پیدا ہو گئے ہیں جو بہتر زندگی کی تلاش و جستجو میں مغربی ممالک میں جا بسے ہیں اور وہاں کی زندگی اور طرز معاشرت کو اردو قارئین تک پہنچا رہے ہیں۔ ان تحریروں میں ہجرت کا کرب و اضطراب بھی ملتا ہے اور ہجرت اور ترک وطن سے اپجے ہوئے مسائل بھی سامنے آ رہے ہیں اور نئی نسل جو بہتر زندگی کی تلاش میں ان ملکوں میں جا کر آباد ہو گئی ہے وہ نئی نئی طرح کے جن تضادات کا شکار ہو گئی ہے ان کا برملا اظہار بھی ملتا ہے۔ شخصیت کی تعمیر و تشکیل بھی ملتی ہے اور اس کی شکست و ریخت کی کہانی بھی۔ دور حاضر میں خالد سہیل ایک ایسا ہی نام ہے جو برصغیر سے بہت دور مغربی ملک کناڈا میں جا بسے ہیں اور بہت ساری ذمہ داریوں اور مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ اردو افسانے اور ناول بھی تخلیق کر رہے ہیں۔ خالد سہیل پاکستان نژاد ہیں اور کناڈا میں ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے ڈاکٹری کے پیشے سے متعلق ہیں۔

خالد سہیل ایک کامیاب ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ادب کے میدان میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کی تخلیقات انھیں ایک کامیاب اور مصروف ادیب ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ موضوعات کے تنوع اور رنگارنگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ فی الحال وہ تیس کتابوں کے مصنف یا مترجم ہیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ ان سب میں ان کا قلم شریکِ غالب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کتابوں میں شاعری کے تین مجموعے، افسانوں کے چار مجموعے اور تین ناولٹ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مضامین اور انٹرویوز کے موضوع پر تین کتابیں، عالمی سیاست کے موضوع پر تین کتابیں، فلسفہ اور نفسیات کے موضوع پر چھ کتابیں اور عالمی ادب سے متعلق موضوع پر ایک کتاب منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ایک کتاب خودنوشت سوانح عمری کے موضوع پر شائع ہو چکی ہے۔ مختلف ادبیات اور سیاست سے متعلق چھ کتابیں ترجمہ ہوکر شائع ہوئی ہیں۔ مطبوعہ کتابوں کے علاوہ افسانوں اور شاعری کے دو آڈیو کیسیٹ بازار میں آچکے ہیں۔ اس طرح سے خالد سہیل شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، مترجم، فلسفی اور مضمون نگار بھی کچھ ہیں، وہ ایک بسیارنویس قلم کار کی حیثیت سے اپنی شناخت تلاش کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔

خالد سہیل کی کہانیوں اور ناولٹ میں افریقہ، سعودی عرب، کناڈا اور امریکہ میں رہنے بسنے والے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی داستانِ ہجرت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے ترک وطن، ہجرت، نسلی تعصب، مذہبی تعصب، جنس، مذہب، حقوق انسانی، بچوں کے مسائل اور عورتوں کے مسائل پر متعدد افسانے تخلیق کیے ہیں۔ خالد سہیل نے صدیوں کی ان روایات پر بھی نشتر زنی کی ہے جن کے گرد خوش عقیدگی نے تقدس کا ہالا بنا رکھا ہے۔ خوش عقیدگی اور دقیانوسیت کے موضوعات پر قلم اٹھانا پل صراط پر چلنے کے مرادف ہے۔ یہ ہمت اور حوصلے کا مطالبہ کرتا ہے اور خالد سہیل نے ان موضوعات پر بے ساختہ اور بے خوف اظہار خیال کیا ہے۔ وہ فرد کی آزادی کے قائل ہیں۔ یہ آزادی خواہ فکر و خیال کی آزادی ہو یا جسم و جان کی: اوہام و عقائد، رسم و رواج اور سماجی اور اخلاقی بندشوں سے آزادی

اور نجات حاصل کرنے کی خواہش ہو یا مذہبی، سیاسی اور تہذیبی طور سے آزادی حاصل کرنے کا جذبہ، خالد سہیل کے افسانوں کے یہی خاص فکری عناصر اور اجزائے ترکیبی ہیں۔ بنیادی طور سے خالد سہیل انسانی رشتوں کے افسانہ نگار ہیں اور روشن خیال فرد کے افکار و اقدار کی کہانیاں سناتے ہیں۔ قوم، مذہب اور نسل نے انسانوں کو جن تعصبات کا شکار بنا رکھا ہے وہ ان جکڑ بندیوں کو توڑ کر فطری انداز میں زندگی جینا چاہتے ہیں۔ ان کی کہانیاں انسانی زندگی کے نئے افہام اور معروضی تفہیم کی جانب ہماری رہنمائی کرتی ہیں اور اردو افسانوں کو ایک نئی فکری اور فنی جہت بخشتی ہیں۔

افسانوی کائنات اور فکشن میں خالد سہیل کا اس قدر سرمایہ موجود ہے کہ ان کے فکر کی رنگا رنگی اور خیال کی وسعت کو منظم طور پر سمجھنے کے لیے، اور موضوعات کی کثرت کے ساتھ ساتھ انھوں نے تکنیک اور ہیئت کے ضمن میں جو جو تجربے کیے ہیں، ان پر سیر حاصل بحث کرنے کی غرض سے اس بات کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ان کے افسانوی سرمایے کا فکری اور فنی جائزہ لیا جائے۔ چونکہ وہ دور حاضر کے افسانہ نگار ہیں اور ان کی کہانیوں میں غور و فکر کے کئی پہلو پوشیدہ ہیں، ان میں نئی اور ماڈرن طرز زندگی کی چمک دمک کے ساتھ ساتھ زندگی اور اس کی رنگینیوں کے پیچھے چھپے ہوئے اضطراب، بے چینی اور کش مکش کی جو تصویریں بنتی ہیں اور اپنی شخصیت اور وجود کو باقی رکھنے کے لیے جد و جہد اور تضادات کا جو المیہ ابھر کر سامنے آتا ہے، وہ اپنی شخصیت کو باقی رکھنے کے ساتھ ساتھ نیا جذبہ اور حوصلہ بھی عطا کرتا ہے۔ یہی تضاد اور کش مکش زندگی کے جملہ عقائد، رسم و رواج اور روایات کو نئے سرے سے سمجھنے اور ان پر غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اردو افسانے کے قارئین کے لیے ان کی نگارشات میں کہانی اور زندگی کے کئی پہلو نظر آتے ہیں۔ اسی تنوع اور رنگا رنگی کی موجودگی نے ان کے فکر و فن کے جائزے کے لیے مہمیز کیا ہے۔

افسانوں اور ناولوں کے موضوعات اور پیش کش کے انداز کے نقطۂ نظر سے خالد سہیل ایک منفرد قلم کار ہیں۔ انھوں نے بعض ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جو تاہنوز اردو فکشن میں بہت زیادہ رواج پذیر نہیں ہو سکے ہیں۔ موضوع اور مواد کی یہی انفرادیت انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اسی خیال کو ذہن میں رکھ کر اس کتاب کا خاکہ تیار کیا گیا ہے۔

زیر بحث موضوع کو چار عناوین میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا عنوان 'خالد سہیل: عہد اور شخصیت' ہے؛ جس میں حالات وکوائف زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے بعض مضامین اور کتابوں کے علاوہ ان کی خودنوشت 'سچ اپنا اپنا' سے بطور خاص استفادہ کیا گیا ہے۔ حالات زندگی بیان کرنے کی پشت پر یہ خیال کارفرما تھا کہ خالد سہیل کی زندگی اور ان کی ادبی اور فکری سرگرمیوں پر ابھی تک تفصیلی مواد موجود نہیں ہے۔ حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی اور تخلیقی ارتقا پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان اسباب وعوامل کا پتہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے، جنھوں نے خالد سہیل کو ادب اور فلسفے کی راہ پر گامزن کیا۔ اس باب کے اخیر میں ان کی اردو اور انگریزی کتابوں کی فہرست اور اردو کتابوں پر عمومی تبصرے کو جگہ دی گئی ہے تاکہ قارئین کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہ ہو کہ خالد سہیل کس بلا کے زودنویس اور بسیار نویس قلم کار ہیں۔ چوں کہ انگریزی کتابیں براہ راست میرے موضوع کے دائرے سے باہر ہیں اس لیے ان پر تبصرے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

دوسرا عنوان 'خالد سہیل کے افسانوی ادب کے موضوعات ومسائل' ہے۔ اس میں ان کے تین افسانوی مجموعوں ('زندگی میں خلا'، 'دو کشتیوں میں سوار' اور 'دھرتی ماں اداس ہے') اور تین ناولوں ('ٹوٹا ہوا آدمی'، 'مقدس جیل' اور 'دریا کے اس پار') کی روشنی میں ان تمام موضوعات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جنھیں ان افسانوں اور ناولوں میں خالد سہیل نے پیش کیا اور ابھارا ہے۔ اس ساری افسانوی کائنات کا حاصل یہ ہے کہ انھوں نے جنس، مغربی طرز زندگی، مہاجرین کے مسائل، عورتوں اور بچوں کے مسائل، اقلیتوں اور سیاہ فاموں کے حقوق، فرد کی آزادی اور انتخاب کے حق، افراد کے نفسیاتی اور ذہنی مسائل اور سیاسی احتجاج کے موضوع پر اظہار خیال کیا ہے اور انھی سے متعلق مسائل کو پوری وضاحت سے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ زیرنظر باب میں انھی موضوعات ومسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا تیسرا عنوان 'خالد سہیل کے افسانوی ادب کا فکری جائزہ' ہے۔ جس میں خالد سہیل کے افسانوی ادب، دیگر مضامین اور تراجم اور انٹرویوز کی مدد سے ان کے فکری

سرچشموں کو تلاش کیا گیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اپنی تحریروں کی بدولت خالد سہیل سماج کے بارے میں، زندگی کے بارے میں، کائنات کے بارے میں اور انسانی رشتوں کے بارے میں کس قسم کا نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ یہ کتابیں اور انٹرویوز یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ ایک غیر متعصب، سیکولر، غیر مذہبی قلم کار ہیں اور انسانی زندگی کے تئیں رجائی اور مثبت نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔ فرد کی آزادی کے قائل ہیں، حیات و کائنات کے بارے میں ترقی پسند خیالات کے حامل ہیں اور انسانی زندگی کی بہتری اور پر امن دنیا کا خواب دیکھتے رہتے ہیں۔

چوتھا اور آخری عنوان 'خالد سہیل کے افسانوی ادب کا فنی جائزہ' ہے۔ جس میں خالد سہیل کی مختلف افسانوی تحریروں سے اقتباسات نقل کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ زبان و بیان، اسلوب اور ہیئت و تکنیک کے باب میں انھوں نے کس قسم کے تجربات کیے ہیں اور کہاں کہاں پرانی قدروں اور میزان سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس باب میں ہم اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ خالد سہیل نے جہاں موضوعات میں اپنی انفرادیت اور حقیقت نگاری کو باقی رکھا ہے۔ اسلوب اور انداز بیان کی سطح پر وہ کوئی ایسا قابل ذکر کارنامہ انجام نہ دے سکے جو قارئین کی توجہ مبذول کر سکے۔ حالاں کہ اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ بعض محاورے اور تعبیرات میں جدت اور تازگی نمایاں ہے۔ لیکن ہیئت اور تکنیک کی سطح پر افسانوں میں بالعموم اور 'دریا کے اس پار' میں بالخصوص یہ رویہ اپنایا ہے کہ صوری طور سے یہ تخلیقات نثر اور افسانہ کے بجائے نظم کا تاثر پیدا کرتی ہیں۔ سطروں کو بحروں کے انداز میں لکھ کر موسیقیت اور تھوڑی سی آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ گویا خالد سہیل نے انسانی آزادی کے تصور کو تکنیک کی سطح پر برتنے کی کوشش کی ہے جس سے افسانے کی موسیقیت اور صوری حسن میں اضافہ ہو گیا ہے۔

کتاب کے آخر میں 'حاصل مطالعہ' کے عنوان سے چاروں عناوین اور ان کے تحت زیر بحث آنے والے ذیلی موضوعات کی تلخیص پیش کی گئی ہے اور افسانوی ادب میں خالد سہیل کے مقام و مرتبے اور حیثیت کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب کو تکمیل کے مراحل تک پہنچانے میں میرے کئی کرم فرماؤں اور دوستوں کا

تعاون شاملِ حال رہا ہے۔ ان سب کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے۔ اس سلسلے میں استادِ محترم ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین صاحب کی شکر گزار ہوں جنھوں نے نیک اور مفید مشوروں سے نہ صرف نوازا بلکہ میری حوصلہ افزائی بھی فرمائی۔ ڈاکٹر خالد سہیل صاحب بھی خاص شکریے کے مستحق ہیں کہ بغیر ان کے تعاون کے اس کام کی تکمیل بہت مشکل ہو جاتی۔ انھوں نے نہ صرف کتابیں فراہم کیں، بلکہ خطوط کے ذریعہ میرے بہت سارے استفسارات کا جواب بہت ہی محبت اور خندہ پیشانی سے دیا۔ ان مراجع کی بھی نشان دہی کی جہاں سے اس موضوع پر مزید مواد حاصل کیا جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی بلاتاخیر جواب دینے کی عادت نے پہلی اور تیسری دنیا کے فرق کو بھی سمجھنے میں مدد کی۔ پروفیسر شارب ردولوی صاحب نے نیک مشورے دیے اور ڈاکٹر موصوف سے اپنے رشتوں اور تجربات کی روشنی میں ان کی شخصیت کے پہلوؤں کو واضح کیا، اور ان کی فکشن نگاری کے تعلق سے میری معلومات میں اضافہ کیا۔ میں اپنی والدۂ محترمہ کی خاص طور سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے لاشعوری طور پر میرے اندر کہانیوں سے دلچسپی کا ذوق پیدا کیا۔ بچپن سے باغ و بہار، قصہ گل بکاؤلی، یوسف زلیخا کی کہانیاں سننے سنانے کی عادت نے پہلے تعلیم کی طرف اور پھر فکشن کی طرف متوجہ کیا۔ عزیزانِ گرامی فیضان سعید اور جابر زماں کا شکریہ بھی بے حد ضروری ہے کہ ان لوگوں نے مواد کی فراہمی میں نہ صرف میری مدد کی، بلکہ اس کام کو تکمیل تک پہنچانے کی مختلف منزلوں میں میرے شریکِ کار رہے۔ ان کے مخلصانہ مشوروں اور عملی تعاون کے لیے میں ان کی بے حد شکر گزار ہوں۔

— شبانہ خاتون

جواہر لال نہرو یونیورسٹی

نئی دہلی-67

19/فروری 2013ء

خالد سہیل: عہد اور شخصیت

عہد اور ماحول

خالد سہیل کے آباواجداد کا تعلق کشمیر سے تھا۔ وہ صدیوں سے اس وادیِ جنت نشان میں رہتے آئے تھے۔ پھر بہتر زندگی اور آب ودانے کی تلاش میں وہ لوگ کوہستانی اور برف پوش وادیوں سے نکل کر پنجاب کے میدانی علاقے میں آ بسے۔ خالد سہیل کی مختلف تحریروں، خودنوشت سوانح عمری اور ان کے افسانوں کی اندرونی شہادتوں کی روشنی میں ان کے آباواجداد اور خاندان کی جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے وہ کچھ یوں ہے کہ ان کے خاندان نے پہلی ہجرت کشمیر کی وادی سے پنجاب کے میدانی علاقے میں کی۔ حالات کی ستم ظریفی اور زمانے کی نیرنگیوں کا شکار ہوکر ان کے اسلاف نے کشمیر سے اپنے خیمے اٹھائے، دھرتی ماں کو الوداع کہا اور پنجاب کی سرزمین میں آ کر بس گئے۔ کشمیر کے بعد ان کا اگلا پڑاو امرتسر کی زمین پر تھا۔ اپنے افسانے 'دھرتی ماں اداس ہے' میں خالد سہیل اپنے خاندان کی ہجرت کے واقعے کو اپنی نانی اماں کی زبانی یوں بیان کرتے ہیں:

ہمارا خاندان بھی ان دریاؤں سے مختلف نہیں
ہم نے بھی کشمیر کے پہاڑوں سے اپنا سفر شروع کیا تھا
ہمارے آباواجداد
انھی پہاڑوں پر بستے تھے

انھی وادیوں میں زندگی گزارتے تھے

......

......

......چنانچہ ہمارے خاندان کا قافلہ کشمیر سے چلا

تو اس نے امرتسر کی سرزمین میں آ کر ڈیرے ڈالے

خیمے اور دل لگائے اور گھر بسائے

جو لوگ اپنی مادری زبان کشمیری بولا کرتے تھے وہ پنجابی سیکھنے لگے

اور دو نسلوں کے بعد بے تکلفی سے بولنے لگے۔[1]

اس اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خالد سہیل کے ننھیال کے لوگ دو تین پشتوں سے امرتسر میں رہتے چلے آئے تھے۔ امرتسر میں ان کے نانا کشمیری شالوں کا کاروبار کرتے تھے اور کاروباری غرض سے کلکتے آیا جایا کرتے تھے۔ لوگ انھیں 'خواجہ صاحب' کے نام سے پکارتے تھے۔ جب 1947ء میں تاریخ نے دھرتی ماں کے دو ٹکڑے کر دیے تو خالد سہیل کے نانا اپنے بال بچوں سمیت آگ کے دریا کو عبور کرتے ہوئے مشرقی پنجاب (امرتسر) سے مغربی پنجاب (لاہور) کی جانب ہجرت کر گئے۔

خالد سہیل کے ددیہال کے لوگ بھی کشمیری النسل تھے۔ ان لوگوں نے بھی کشمیر سے پنجاب کے امرتسر اور پھر لاہور کی طرف ہجرتیں کیں اور اسی علاقے کو اپنا مستقر اور وطن بنالیا۔ خالد سہیل کا خاندان مذہب سے بھی لگاؤ رکھتا تھا اور سائنسی اور منطقی رویوں اور قدروں کا بھی احترام کرتا تھا۔ ان کے خاندان کے ایک بزرگ مولانا ثناء اللہ امرتسری اپنے عہد کے ایک مشہور عالم دین تھے۔ ان کی مایہ ناز تصنیف 'تفسیر ثنائی' تفسیر کے میدان میں اختصاص کا درجہ رکھتی ہے۔

ہمارے پاس اس بات کا سراغ لگانے کی کوئی مستند دستاویز نہیں ہے کہ خالد سہیل کے اسلاف کتنی پشتوں پہلے کشمیر چھوڑ آئے تھے۔ البتہ ان کے دادا اور دادی کی شخصیت اور عادات و

1. دھرتی ماں اداس ہے، ص: 24-23

اطوار کے بارے میں ہمارے پاس کچھ شہادتیں ہیں۔ خالد سہیل نے اپنی تحریروں میں اپنے دادا اور دادی کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا، اس کے برخلاف اپنی نانی اماں اور نانا جان کے بارے میں کچھ تفصیلات ضرور قلم بند کی ہیں۔ اس کی ایک صاف اور واضح وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ خالد سہیل، خاندان کے دیگر افراد کے بمقابل اپنی نانی اماں کی شخصیت، کردار اور انسانی قدروں کے تئیں ان کے رویے کا احترام کرتے تھے اور ان کی سحر آمیز شخصیت سے حد درجہ متاثر تھے۔

خالد سہیل کے دادا ایک لبرل انداز کے مفکر تھے۔ وہ مختلف معاملات میں اپنی رائے تو ضرور دیتے تھے لیکن اوروں سے اس رائے کو تسلیم کرانے پر کبھی اصرار نہیں کرتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ انسان خود حقائق کا مشاہدہ کرے اور اپنے نظریات و خیالات کو پوری مضبوطی اور استدلال کے ساتھ پیش کرے۔ وہ ایک انسان دوست، مخلص غم گسار اور دکھ درد بانٹنے والے انسان تھے۔ ان کی دادی بھی ایک حق گو خاتون اور ایثار و قربانی کا جیتا جاگتا نمونہ تھیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خالد سہیل کے ننھیال اور ددھیال کے لوگ اپنے اپنے کنبوں کے ساتھ کشمیر سے ہجرت کر کے پہلے امرتسر اور پھر تقسیمِ ہندوستان کے بعد امرتسر سے لاہور آ بسے۔ چوں کہ دونوں خاندانوں کی جڑیں کشمیر کی مٹی میں پیوست تھیں اس لیے ان کے درمیان تعلقات اور ذہنی ہم آہنگی کا ایک رشتہ قائم تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے خالد سہیل کے والد اور ان کی والدہ کی شادی روایتی انداز میں کر دی۔ یہ 1950ء کی بات ہے جب ان کے والدین شادی کے رشتے سے منسلک ہوئے تھے۔ ان کے والد خواجہ عبدالباسط اور امی جان عائشہ قاسم شادی کے مقدس رشتے سے بندھے ہونے کے باوجود ذہنی طور سے ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ دونوں الگ الگ دنیاؤں میں رہتے تھے۔ دونوں ہی کشمیری خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور پنجابی زبان بولتے تھے لیکن ان کے درمیان جذبات و احساسات اور نظریات و افکار کی سطح پر وہ رشتہ قائم نہ ہو سکا جس کا تصور ان کے اہلِ خاندان نے کیا تھا کہ دونوں ایک علاقے، ایک زبان، ایک تہذیب اور ایک ہی معاشرت کی مضبوط ڈور سے بندھے ہوئے ہیں اس لیے خوش حال زندگی گزاریں گے۔ ان کے والدین بظاہر خوش حال زندگی بسر کرتے تھے لیکن ان کے ہاں ذہنی

ہم آہنگی کا فقدان تھا، ساتھ ہی دونوں نفسیاتی مسائل کا شکار بھی تھے۔ اس بات کا ذکر خالد سہیل نے اپنی خودنوشت 'سچ اپنا اپنا' میں بڑی صاف گوئی سے کیا ہے:

......وہ دونوں ایک ہی گھر میں رہ کر بھی دو مختلف دنیاؤں میں رہتے تھے

......وہ دونوں ایک ہی زبان بولنے کے باوجود ایک دوسرے سے دل کی بات نہ کر سکتے تھے

......وہ ایک ہی معاشرے میں پلے بڑھے تھے لیکن مختلف روایتوں کو پسند کرتے تھے

......میری امی اپنے خاندان کی سب سے بڑی بیٹی تھیں اور ابو اپنے خاندان کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے اور

......میری امی کا تعلق ایک روایتی اور مذہبی خاندان سے تھا لیکن ابو کا تعلق ایک غیر روایتی اور لبرل خاندان سے تھا۔ وہ سائنس کے قریب اور خدا اور مذہب سے بہت دور تھے۔[2]

والدین کی شادی کے دو برس بعد خالد سہیل کی ولادت ہوئی۔ انھوں نے اپنی تاریخ پیدائش 9/ جولائی 1952ء تحریر کی ہے۔ اپنی ولادت کا ذکر کرتے ہوئے خالد سہیل نے لکھا ہے:

میری پیدائش کے وقت میرے والدین لاہور میں تھے لیکن میرے ننھیال کراچی چلے گئے تھے۔ ہمارے خاندان کی کئی اور کشمیری اور پنجابی خاندانوں کی طرح یہ روایت تھی کہ پہلا بچہ نانی کے گھر پیدا ہو۔ چنانچہ جب میری والدہ حاملہ تھیں تو وہ کراچی چلی گئیں۔ سنا ہے کہ وہ 9/ جولائی 1952ء کی ایک سندر سہ پہر تھی جب مجھے اس حسین دنیا میں خوش آمدید کہا گیا۔ سارا خاندان مسرور تھا۔ میں خاندان کا پہلا نواسہ تھا اس لیے سب کی خوشیاں دوبالا ہو گئی تھیں۔[3]

---

2. سچ اپنا اپنا: ص:14
3. سچ اپنا اپنا: ص:10

خالد سہیل ابھی دو برس کے تھے کہ ان کے والد نے ریاضی میں ایم۔اے کر لیا اور فوراً ہی انھیں گورنمنٹ کالج، کوہاٹ میں لیکچرشپ کی ملازمت مل گئی۔ خالد سہیل اپنے والدین کے ساتھ کوہاٹ چلے گئے۔ یہ شہر لاہور سے تین سومیل کی مسافت پر واقع تھا۔ یہاں کی تہذیب اور رسم و رواج لاہور سے مختلف تھے۔ زبان اور ثقافت نئی تھی۔ یہ پختونوں کی تہذیب وثقافت والا شہر تھا، یہاں کی ہر چیز میں سرحدی رنگ نمایاں تھا۔ اس طرح خالد سہیل کے ایام ایک بالکل نئی طرح کی معاشرت اور تہذیب میں بسر ہونے لگے۔ خالد سہیل نے اپنی زندگی کی ابھی چار بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ ان کے والدین نے انھیں اسکول بھیجنے کا فیصلہ کیا اور شہر کے سینٹ جوزف اسکول میں داخل کرادیا۔ خالد سہیل پہلے دن اسکول گئے تو صاف ستھرے، خوب صورت ماحول اور اسٹاف کی شفقت آمیزیوں سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکے۔ ان کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ ایک بدقسمت اور غریب قوم کے خوش نصیب بچے ہیں جن کو انگریزی اسکول میں داخل کرایا گیا ہے ورنہ اسی ملک کے اسی فیصدی بچے سرکاری اسکولوں سے بھی محروم تھے۔ اس ماحول اور شفقت آمیز برتاؤ کی حسین یادیں ان کے دل ودماغ پر گہرے نقوش ثبت کرنے میں کامیاب رہیں۔ یوں ان کا تعلیمی سلسلہ شروع ہوا۔ ایک طرف وہ اسکول میں انگریزی اور عصری تعلیم حاصل کرتے اور دوسری طرف ان کی والدہ گھر کے اندر انھیں دینیات اور اردو کی کتابیں پڑھاتی تھیں۔ یہ دونوں دھارے آگے چل کر خالد سہیل کی شخصیت کے اہم جزو بنے۔ خالد سہیل نے اعتراف کیا ہے کہ ان کی والدہ نے ایسی بنیادیں استوار کیں جن کے بغیر ان کی ادبی زندگی کی عمارت ایستادہ نہیں ہو سکتی تھی۔

خالد سہیل کی عمر پانچ برس کی تھی کہ ان کے گھر میں ایک اور بچی کی ولادت ہوئی، یہ ان کی چھوٹی بہن تھیں، ان کا نام عنبریں کوثر تجویز کیا گیا۔ جیسا کہ عام طور سے ہوتا ہے کہ نئی شخصیت کی آمد سے بچے وحشت کا شکار ہو جاتے ہیں، خالد سہیل کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، پہلے پہل تو انھیں اپنی بہن سے وحشت کا احساس ہوا لیکن آہستہ آہستہ جب شعور کی منزل میں قدم رکھا تو وہی بہن ان کی دوست، غم گسار، ہمراز اور ہمدرد بن گئیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس رشتے

میں مزید پختگی، پائداری اور استحکام پیدا ہوا۔

زندگی کی کشتی اطمینان بخش طریقے سے رواں دواں تھی کہ اچانک ایک طوفان سے ٹکرا گئی۔ یہ 1962ء کی بات تھی، خالد سہیل ابھی دس برس کے تھے کہ ان کے والد ایک نفسیاتی بیماری کا شکار ہوگئے، وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکے تھے۔ بیماری کا یہ سلسلہ ایک سال تک چلا، مختلف طریقوں سے ان کا علاج کیا گیا، روایتی طریقۂ علاج کے علاوہ غیر روایتی طریقوں سے بھی ان کی بیماری پر قابو پانے کی کوششیں ہوئیں۔ ڈاکٹروں نے تجویز کیا کہ عبدالباسط کی بیماری جسمانی کم، ذہنی اور نفسیاتی زیادہ ہے۔ آخر کار سال بھر کے ذہنی کرب اور اذیت سے دوچار رہنے کے بعد خالد سہیل کے والد کو اس بیماری سے اس شکل میں نجات ملی کہ انھوں نے کالج کی نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور کالج کے بجائے ایک ہائی اسکول میں ریاضی کا مضمون پڑھانے لگے۔ ان کے اندر ایک حیرت انگیز تبدیلی یہ واقع ہوئی کہ وہ ساری عمر خدا اور مذہب سے دور رہے تھے لیکن اس حادثے کے بعد انھوں نے درویشانہ طرزِ زندگی اختیار کر لیا، وہ مذہبی ہوگئے، داڑھی رکھ لی۔ سادہ لباس، سادہ کھانا اور سادہ طرزِ زندگی کو اپنا شعار بنا لیا اور پشاور کے ایک ہائی اسکول میں ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ اس طرح خالد سہیل کے والدین ایک مرتبہ پھر صوبۂ سرحد میں رہنے لگے۔

بیماری سے شفایاب ہونے کے بعد خالد سہیل کے والد نے پھر اسکول کا رخ کیا اور نئے ماحول سے بڑی حد تک ہم آہنگی پیدا کرنے میں کامیاب بھی ہوئے۔ اب جوں جوں ان کی حالت میں بہتری کے آثار پیدا ہوتے گئے، ان کی والدہ مختلف قسم کی ذہنی بیماریوں کا شکار ہوتی گئیں۔ علاج کی ہر کوشش ناکام ہوتی، ان کا جسم ایک بیماری سے نجات حاصل کرتا تو دوسری بیماری اس میں اپنا آشیانہ بنا لیتی۔ جس طرح ان کے والد ایک ذہنی اور نفسیاتی مرض میں مبتلا تھے، ان کی امی جان بھی اسی قسم کے مسائل سے زندگی بھر نبرد آزما رہیں۔ شاید یہ ایک بڑی وجہ تھی کہ ان نفسیاتی تشنج کے ماحول میں رہتے رہتے خالد سہیل پہلے ایک ڈاکٹر اور پھر نفسیاتی معالج بن گئے۔

خالد سہیل کی والدہ سخت طبیعت کی تھیں۔ وہ اپنے بچوں سے اسکول کا کام جلد از جلد مکمل کر لینے کا اصرار کرتیں۔ اس دوران اگر کوئی بات مزاج کے خلاف ہوتی تو زجر و توبیخ کے ساتھ

ساتھ مار پیٹ اور سرزنش کرنے سے بھی دریغ نہ کرتیں۔ ان کو تعلیم سے خاص قسم کا لگاؤ تھا۔ وہ تعلیم کو زندگی اور اس کے تاریک راستوں کو روشن کرنے کا بہترین ذریعہ سمجھتی تھیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے اصول وضوابط اور ڈسپلن کی سختی سے پابندی کرتی تھیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ضعیف الاعتقادی اور توہمات میں بھی یقین رکھتیں، وہ اپنی مشرقی اقدار اور روایات کو مضبوطی سے تھامے رہیں۔ اس کے برخلاف ان کے والد نرم مزاج اور شفیق طبیعت کے مالک تھے۔ وہ ان کی بہن عنبر کو 'جنت کا پھول' کہتے اور عام طور پر اپنے بچوں کی طرف داری کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خالد سہیل رفتہ رفتہ جذباتی طور سے اپنی ماں سے دور اور اپنے والد سے قریب تر ہوتے گئے۔ اس کے باوجود خالد سہیل اپنی امی جان کی شفقت ومحبت اور مہربانیوں کے دل سے قائل تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ان کی والدہ یہ سب کچھ اپنے بچوں کی فلاح وبہبود اور ان کی بہترین تربیت کے لیے کر رہی تھیں۔ وہ اپنے بچوں کو زندگی کے کارزار میں بلند مقام پر فائز دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے خالد سہیل ایک جگہ لکھتے ہیں:

> .....اگر وہ مجھے اچھے اسکول نہ بھیجتیں اور میری اعلیٰ تعلیم کے بارے میں فکر مند نہ ہوتیں تو میں ایک ڈاکٹر یا ماہرِ نفسیات نہ بن سکتا اور.....اگر وہ میرے ہاتھ میں کاغذ اور قلم نہ پکڑاتیں تو میں لکھاری نہ بن سکتا۔ انھوں نے کبھی سوچا ہی نہ ہوگا کہ ان کا بیٹا بڑا ہو کر بیس سے زیادہ کتابوں کا مصنف بنے گا۔ وہ مجھے شاعر سے زیادہ ایک ڈاکٹر کے طور پر دیکھنا چاہتی تھیں کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ شاعر ساری عمر بھوکے رہتے ہیں، کیوں کہ وہ خواب بیچتے ہیں اور اس دور میں سہانے خواب خریدنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں۔
>
> اب جب کہ امی جان سے میرا نیا رشتہ استوار ہو رہا ہے مجھے اس کی بہت خوشی ہو رہی ہے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ اگر میری اپنی امی جان کے ساتھ رشتے میں کرب نہ ہوتا تو شاید میں

تسبیح کے دانے
اپنے دور کے یوسف کی ماں اور
دھرتی ماں اداس ہے
جیسے افسانے تخلیق نہ کر پاتا۔ جہاں مجھے ان افسانوں کو تخلیق کرنے کی خوشی ہے وہیں مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ اب میرے دل میں ان کے لیے محبت اور چاہت کے جذبات ابھر رہے ہیں اور وہ بھی لاشعوری اور فطری طور پر ہو رہے ہیں۔ دیر آید درست آید۔[4]

خالد سہیل نے دسویں کا امتحان پشاور کے ہائی اسکول کنٹونمنٹ بورڈ سے پاس کیا، اس کے بعد وہ پشاور کے ہی ایڈورڈز کالج میں داخل ہو گئے۔ لفظوں سے ان کی دوستی تو اسی وقت سے ہو گئی تھی جب ابھی وہ پرائمری اور مڈل اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ ایڈورڈز کالج کے دوران قیام انھوں نے پہلا افسانہ 'دست بوسی' تخلیق کیا تھا۔ یہ افسانہ کالج میگزین ایڈورڈین (Edwardian) میں شائع ہوا تھا۔ اس پہلی کہانی میں مذہبی قائدوں اور رہنماؤں کی منافقت کو بے نقاب کیا گیا تھا۔ اسی رسالے میں ان کا ایک اور مضمون سعادت حسن منٹو پر بھی شائع ہوا تھا۔ اس پہلے افسانے کی اٹھان سے یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہ تھا کہ آنے والے وقتوں میں خالد سہیل کا ذہن کس قسم کے مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنائے گا۔ وہ منٹو کی طرح سماج کے چہرے سے نقاب اتار کر اس کو اصلی روپ میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایک روایت شکن ادیب کی صورت میں اپنی شناخت تلاش کر رہے تھے۔ اس واقعے سے پہلے جب ابھی وہ آٹھویں کلاس کے طالب علم تھے تو ان کا پہلا مضمون 'رابعہ بصری' بچوں کے رسالے 'بچوں کی دنیا' میں شائع ہو چکا تھا۔ اس مضمون کی اشاعت نے انھیں اعتماد، ہمت اور حوصلہ تو دیا ہی، قلم کو ہاتھ میں تھامنے کا شعور بھی بخشا اور اس طرح لفظوں سے ان کی دوستی ایک مضبوط رشتے میں بندھ گئی۔

ایڈورڈز کالج سے فراغت کے وقت خالد سہیل سترہ برس کے نوجوان تھے، انھوں نے

4. سچ اپنا اپنا: ص: 25

خیبر میڈیکل کالج، پشاور میں داخلے کی درخواست دی جو بدقسمتی سے رد کردی گئی۔ خالد سہیل کی ماں کا خواب تھا کہ ان کا بیٹا بڑا ہو کر ایک کامیاب ڈاکٹر بنے۔ ایک ماں کے اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنانے کی توجیہ کرتے ہوئے ایک جگہ خالد سہیل نے لکھا ہے کہ:

> امی جان کو مجھے ڈاکٹر بنانے کا شوق اس وقت شروع ہوا جب انھوں نے میرے بائیں کان کا آپریشن کروایا کیوں کہ پیدائشی طور پر میرے بائیں کان کا نچلا حصہ غائب تھا اور میری امی جان میرے سر کو رومال سے ڈھانپے رکھتی تھیں تا کہ لوگوں کو میرا آدھا کان نظر نہ آئے۔ وہ سرجن سے اتنی متاثر ہوئی تھیں کہ انھوں نے ڈاکٹر سے کہا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو آپ کی طرح ٹوپی والا ڈاکٹر بناؤں گی، اور میری امی جان کا مجھے ڈاکٹر بنانے کا خواب اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ میں ڈاکٹر بن نہیں گیا۔[5]

خیبر میڈیکل کالج میں پہلی بار ان کی درخواست مسترد ہوگئی لیکن بالآخر اسی کالج سے انھوں نے 1974ء میں ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی۔ اس کالج نے خالد سہیل کو ڈاکٹر ہی نہیں بنایا بلکہ ان کی ادبی زندگی کو بھی ایک سمت عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ گھر آنگن کے ماحول کا اثر تھا کہ بچپن سے لے کر جوانی تک انھوں نے ادب، فلسفہ، مذہب اور نفسیات کی ڈھیر ساری کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ ان کتابوں میں فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، احمد فراز، جوش ملیح آبادی، ناصر کاظمی کی شاعری شامل تھی؛ منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور غلام عباس کے افسانے شامل تھے؛ آغا حشر کاشمیری اور امتیاز علی تاج کے ڈرامے تھے؛ سگمنڈ فرائڈ، الفریڈ ایڈلر اور کارل مارکس کی سیاسی اور نفسیاتی تخلیقات شامل تھیں اور ابوالاعلیٰ مودودی، غلام احمد پرویز، علامہ اقبال اور ابوالکلام آزاد کے مذہبی مقالے اور تفسیریں شامل تھیں۔

کالج میں قیام کے دوران خالد سہیل اور چند احباب نے مل کر ایک ادبی گروپ تشکیل دیا، جس کا نام 'اخوان الشیاطین' تجویز کیا گیا۔ اس گروہ میں تین شاعر، ایک موسیقار، ایک

---

5. سچ اپنا اپنا، ص 11

کارٹونسٹ اور ایک کرکٹر شامل تھے۔ یہ گروہ شاعری بھی کرتا، لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کا موقع بھی تلاش کرتا، ہنستا کھیلتا اور زندگی اور تعلیم کی لذتوں سے لطف اندوزی بھی کرتا۔

خالد سہیل جب خیبر میڈیکل کالج میں ڈاکٹری کی نبض شناسی کر رہے تھے اور انسانی جسم کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کر رہے تھے، اسی دوران ان کے ادبی اور فکری سرچشمے بھی پھوٹ رہے تھے، دونوں کام ساتھ ساتھ جاری تھے۔ کالج میں ادبی، فکری اور تخلیقی شخصیت کو پروان چڑھانے اور انھیں بال و پر عطا کرنے کے وافر مواقع میسر تھے۔ اس موقعے کا خالد سہیل نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ادبی اور فکری کاوشوں کو تراشتے رہے، وہ ایک موقع پر لکھتے ہیں:

> ہمارے کالج میں ہر سال ایک بڑا مشاعرہ ہوا کرتا تھا جس میں ملک کے مشہور شاعروں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ مہمان شعرا سے پہلے کالج کے طلبا و طالبات کو اسٹیج پر آ کر اپنا کلام سنانے کا موقع دیا جاتا تھا اور اچھے شاعروں اور شاعرات کو انعام دیے جاتے تھے۔ اس شام تقریباً پانچ سو لوگوں کا مجمع تھا۔ ملک کے تین مشہور شاعر جج تھے۔ بہت سے طلبا اور طالبات نے اپنا کلام سنایا۔ میں نے اپنی ایک نظم سنائی جس کا عنوان تھا 'سرخ دائرہ'۔ وہ نظم ایک ایسی نوجوان عورت کے بارے میں تھی جسے زندگی میں پہلی دفعہ حیض نہ آیا ہو اور وہ متفکر تھی کہ کہیں حاملہ تو نہیں۔ نظم اس انداز سے کہی گئی تھی کہ حمل اور حیض کا ذکر تو نہ تھا لیکن سمجھنے والے سمجھ جاتے تھے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔
>
> میں اسٹیج پر گیا۔ سارا ہال خاموش تھا۔ میں نے نظم سنائی۔ سارا ہال خاموش رہا۔ میں واپس لوٹ آیا۔ سارا ہال خاموش رہا۔ میں سمجھا کسی کو میری نظم سمجھ میں نہیں آئی۔ نظم اس طرح لکھی گئی تھی کہ ایک عورت اپنے بارے میں بات چیت کر رہی تھی۔ چنانچہ نظم کی 'میں' عورت تھی۔ مقابلے کے آخر میں میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اول انعام، ایک ونیس کا

مجسمہ مجھے پیش کیا گیا۔ اس وقت سارا ہال تالیاں بجا رہا تھا۔ اگلے دن میری ایک جج شاعر سے ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگے 'میں نے پورے اردو لٹریچر میں اس خیال پر کوئی نظم نہیں پڑھی۔ تمھارے کلام میں جدت تھی۔' ان کی باتیں سن کر میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔[6]

وہ جج شاعر جس نے بڑی شفقت سے خالد سہیل کی نظم کی تعریف کی تھی، احمد فراز تھے۔ اس کے علاوہ ججوں میں احمد ندیم قاسمی، خاطر غزنوی اور محسن احسان تھے۔

اوپر کے اقتباس میں خالد سہیل نے تین مشہور شاعروں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ججی کے فرائض انجام دیے تھے لیکن ایک اور مقام پر انھوں نے احمد فراز کے علاوہ احمد ندیم قاسمی، خاطر غزنوی اور محسن احسان، کل چار شاعروں کا ذکر کیا ہے جو اس مشاعرے میں موجود تھے اور ججی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ خالد سہیل کی دو مختلف تحریروں میں دو مختلف تعدادوں کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ چونکہ اس مشاعرے میں ان چاروں شاعروں نے شرکت کی تھی۔ اب یہ ہوسکتا ہے کہ خالد سہیل کے ذہن سے یہ بات نکل گئی ہو کہ ججی کے فرائض تین شاعروں نے انجام دیے تھے یا چاروں شاعروں نے اس میں حصہ لیا تھا۔ بہرحال یہ بات اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنا ان شاعروں کا یہ اعتراف کہ خالد سہیل نے بالکل ایک نئے خیال کو اپنی نظم کا موضوع بنایا تھا اور ایک اچھوتے اور نادر تجربے کو نظم کے قالب میں ڈھالا تھا اور غالباً اسی لیے ان کو پہلے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

اسی سال کالج میگزین 'سینا' میں ان کا افسانہ 'بوسہ' کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ افسانہ نرسوں کے بارے میں تھا۔ اس کہانی میں ایک نرس کا کردار ہے جو کینسر کے ایک مریض کی تیمارداری پوری محنت، لگن، اخلاص اور تن دہی سے کرتی تھی۔ اس کے خلوص، ایثار اور شفقت آمیز رویے سے متاثر ہوکر مریض بھی رفتہ رفتہ جذباتی طور پر اس کے قریب آتا گیا۔ آخر کار ایک دن مریض نے نرس سے ایک بوسے کی فرمائش کر ڈالی۔ نرس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس کے دل و

---

6. انفرادی اور معاشرتی نفسیات، ص: 64

دماغ کے بیچ 'ہاں' اور 'نہیں' کی ایک جنگ جاری ہو گئی، نرس ایک شدید کشمکش کا شکار تھی۔ اس کا دماغ اس کو اس کام سے باز رہنے کی تلقین کرتا تھا اور 'نہیں نہیں' کہتا تھا جب کہ اس کا دل مریض کی خواہش پوری کر دینے پر آمادہ تھا۔ آخر کار اس نے مریض کو چوم لیا۔ اس عمل کے فوراً بعد ہی وہ مریض اس دنیا سے چل بسا۔

خالد سہیل جہاں اس افسانے کی وساطت سے نرس کے کردار کی عظمت کو اجاگر کرنا چاہتے تھے کہ وہ انسانیت کی خدمت کے لیے کس طرح اپنے ماحول اور پیشے سے بلند ہو گئی تھی، بدقسمتی سے اس کا ردِعمل اس صورت میں سامنے آیا کہ نرسوں نے خیال کیا کہ خالد سہیل نے ان کے پیشے کے تئیں اہانت آمیز رویہ اپنایا ہے، وہ اس پیشے کی اخلاقیات کو مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے اور ان کی کردار کشی کر رہا ہے۔ نرسیں خالد سہیل سے بے حد ناراض اور خفا ہوئیں۔

خیبر میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد خالد سہیل نے پشاور کے مشہور لیڈی ریڈنگ اسپتال میں سال بھر کی انٹرنشپ مکمل کی۔ اس کالج کی 75 سالہ تاریخ میں یہ انوکھا واقعہ تھا کہ ایک مرد ڈاکٹر نے زچہ بچہ وارڈ میں اپنی انٹرنشپ مکمل کی۔ یہ تجربہ خالد سہیل کی زندگی کا بھی ایک اہم واقعہ اور تجربہ ثابت ہوا۔ یہاں ان کو عورتوں کے مسائل کو بے حد قریب سے دیکھنے، جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا جو عام حالات میں ممکن نہیں ہوتا۔ یوں تو عورتوں کے بارے میں خالد سہیل کا رویہ پہلے سے ہی ہمدردانہ تھا لیکن اس تجربے کے بعد عورتیں انھیں مزید قابلِ رحم نظر آنے لگیں۔ اس وارڈ میں وہ چھ ماہ رہے اور پھر وہاں سے زنانہ وارڈ میں منتقل ہو گئے۔ یہاں بھی انھوں نے چھ ماہ کا عرصہ گزارا۔ اس طرح سے ایک سال کے اندر ان کو عورتوں کے ہر قسم کے مسائل اور مصائب سے واسطہ پڑا، انھوں نے اس کو بڑی ہمدردی اور محنت سے سرانجام دیا۔ ادبی اور طبی طور سے یہ تجربہ آنے والے وقت میں ان کے لیے معاون و مددگار ثابت ہوا اور اس نے خالد سہیل کے رویوں کو تشکیل دینے اور اس کو ایک مخصوص شکل عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

1976ء میں خالد سہیل نے پاکستان کو خیرباد کہہ دیا۔ میڈیکل کالج پشاور سے ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ایران چلے گئے۔ ایران کے شہر ہمدان میں جہاں مشہور حکیم بوعلی

سینا کا مزار ہے، اس کے گردونواح میں بچوں کے ایک اسپتال میں انھوں نے ڈیڑھ سال تک طبی خدمات انجام دیں۔ اس اسپتال میں بھی ان کا واسطہ مستقل طور سے عورتوں سے ہی رہا، کیوں کہ بچوں کی نگہداشت اور علاج کے لیے ان کی مائیں، خالائیں اور نانیاں ان کے ساتھ آتیں۔ خالد سہیل کو قیامِ ایران کے دوران عورتوں کے ساتھ ساتھ بچوں کی زندگی، ان کے مزاج اور ان کے مسائل کو قریب سے جاننے اور دیکھنے کا موقع ملا۔ ایران کے معاشرے میں پاکستانی معاشرے کی طرح حبس اور گھٹن تو نہیں تھی لیکن وہاں کی فضا میں ایک عجیب قسم کا خوف تھا اور سیاسی اور معاشرتی موضوعات پر وہاں کے لوگ زبان نہ کھولنے میں ہی عافیت سمجھتے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب 77-1976ء میں شاہِ ایران رضا شاہ پہلوی کی حکومت تھی۔ شاہ نے بعض بڑے سخت قوانین بنا رکھے تھے۔ اسی لیے وہاں کے عوام ایک خاص طرح کے خوف اور دہشت کی نفسیات سے دوچار تھے۔ اس ملک میں ان کا قیام ڈیڑھ سال تک رہا۔ پھر جیسے ہی 1977ء میں میموریل یونیورسٹی، کناڈا میں نفسیات کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انھیں داخلہ ملا تو فوراً ہی انھوں نے ایران کو سدا کے لیے خدا حافظ کہہ دیا اور ایک نئے ملک کی راہ لی۔ اس طرح خالد سہیل کے خاندان کی ہجرت کا جو سفر کشمیر کی وادیوں سے شروع ہوا تھا، اس نے خالد سہیل کے پاؤں میں بھی چکر ڈال دیے تھے۔ جب ہم ان کی زندگی کے شب و روز کو آئینۂ ایام میں دیکھتے ہیں تو بآسانی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ لاہور کی گلیوں کا یہ معصوم بچہ کس طرح پختون تہذیب کے علاقے کوہاٹ میں اپنی زندگی کے ابتدائی ایام بسر کرتا ہے، وہاں سے پھر پشاور جا کر اپنا تعلیمی سفر جاری رکھتا ہے۔ پشاور کے بعد اس کا اگلا پڑاو ایران کا شہر ہمدان ہوتا ہے اور پھر اخیر میں وہ مغرب کے ملک کناڈا میں اپنے ملک، اپنی تہذیب و ثقافت، اپنی مٹی اور اپنے خاندان کی روایتوں سے بہت دور ایک نئے ماحول اور معاشرے میں زندہ ہے اور برگ و بار لا رہا ہے۔ شاید اقبالؔ نے خود اپنے اور خالد سہیل جیسے لوگوں کے لیے ہی یہ شعر تخلیق کیا ہوگا، آخر چاہے اقبالؔ ہوں یا خالد سہیل؛ دونوں کا خاندان تو کشمیر کی وادیوں سے سرکتا ہوا پنجاب کے میدانوں میں آکر آباد ہوا تھا اور اقبالؔ نے بھی سیال کوٹ اور لاہور میں قیام کے بعد، اعلیٰ تعلیم کی غرض سے اور بعد ازاں سیر و سیاحت اور حصول

تجربات کی خاطر مغربی ممالک کا سفر کیا تھا:

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی

گھر مرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

خالد سہیل نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے 1977ء میں کناڈا کا رخ کیا تھا، پاکستان میں تو وہ ایک مکمل ڈاکٹر بن ہی چکے تھے۔ کناڈا میں انھوں نے تخصص (specialization) کے لیے نفسیات کے موضوع کا انتخاب کیا۔ خالد سہیل کو شروع سے ہی ادب، فلسفہ اور سائنس سے بے حد لگاؤ تھا اور وہ بچپن سے ہی بہ ظاہر مختلف نظر آنے والے ان موضوعات کے درمیان نقطۂ اتحاد تلاش کرتے رہے تھے۔ ان کو وراثت کے طور پر اپنے خاندان سے مذہب اور سائنس کی جو مشترکہ روایت ملی تھی ان سب نے مل کر خالد سہیل کے اندر نفسیات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی صلاحیت کو جنم دیا اور انھوں نے محسوس کیا کہ نفسیات ہی ایک ایسا موضوع ہے جس میں سائنس، ادب اور فلسفے کی برکتوں سے فائدہ اٹھا کر مریضوں کا علاج کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح سے مریض اپنی بیماری سے شفایاب بھی ہو سکے گا اور خود ڈاکٹر کی ادبی تشنگی کی سیرابی کا سروسامان ہوتا رہے گا۔

جب خالد سہیل کو میموریل یونیورسٹی، نیوفاؤنڈ لینڈ میں نفسیات کی فیلوشپ کرنے کے لیے داخلہ مل گیا تو اس یونیورسٹی سے انھوں نے ایف آر سی پی (.F.R.C.P) کی ڈگری حاصل کی۔ نیوفاونڈ لینڈ، کناڈا کا مشرقی ترین صوبہ ہے جس کا دارالخلافہ سینٹ جانز ہے۔ اس شہر کی آبادی ایک لاکھ افراد پر مشتمل تھی۔ خالد سہیل، پاکستان اور ایران میں گھٹن اور حبس زدہ معاشرے میں رہتے آئے تھے خواہ وہ پاکستان کے مختلف شہر اور قصبات ہوں یا ایران میں ہمدان کی معاشرت اور تہذیب؛ ہر جگہ مشرقی روایات کی اونچی اونچی دیواریں کھڑی تھیں، جس کی فضا میں گھٹن تھی، دل اور زبان پر مذہب اور سماج کے تالے لگے تھے، فرد کی انفرادیت بے معنی تھی، ذہنی اور فکری آزادی کا تصور ہی نہ تھا۔ فرد، معاشرے اور سماج سے علاحدہ اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس قسم کے معاشرے میں خالد سہیل کی ادبی اور نفسیاتی ذوق کی پرورش ہوئی تھی، چنانچہ جب وہ

مغرب کی کھلی فضا میں پہنچے تو ان کے فکر و خیال اور جذبۂ آزادی کو پر لگ گئے، تخلیقی پرواز نے اڑان بھرنی شروع کی۔ ایک مقام پر انھوں نے لکھا ہے:

......اس شہر میں چند ہفتوں میں ہی مجھے احساس ہونے لگا جیسے میں پاکستان اور ایران کی زندگی کی پچیس سالہ تنگ و تاریک سرنگ کے بعد ایک کھلی فضا میں آ گیا ہوں۔ میں نے ماحول کو آزادی اور جمہوریت کی تازہ ہوا کے جھونکوں سے معطر پایا۔ اس شہر میں پاکستان کے صرف چند خاندانوں کی موجودگی کی وجہ سے مجھے مقامی لوگوں کے ساتھ کام کرنے، ملنے جلنے اور قریب آنے کا بھرپور موقع ملا۔[7]

خالد سہیل نے سینٹ جانز میں چار سال گزارے۔ اس شہر میں تعلیمی منزلوں کو سر کرنے کے ساتھ ساتھ حسن اور رومان کی بہت ساری وادیوں، پر پیچ گلیوں اور رنگین سڑکوں سے واقفیت حاصل کی۔ یہ نئے نئے تجربے ان کی تخلیقی عمارت کو اونچا اٹھانے میں سنگ و خشت کا کام دیتے رہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد خالد سہیل کو نیو برنزوک (New Brunswick) میں بطور ماہر نفسیات ملازمت مل گئی۔ وہ اس شہر میں 1981ء سے 1983ء تک رہے۔ ان دو برسوں میں خالد سہیل خود کو اس شہر کے مزاج و ماحول سے ہم آہنگ نہ کر سکے۔ ان کا دل وہاں نہیں لگا اور ادبی اور رومانوی طور پر اس شہر کی فضا انھیں راس نہ آئی۔ اسی دوران سات سال کے طویل وقفے کے بعد وہ اپنے وطن پاکستان آئے، یہ سات سال ان کی زندگی کو ایک واضح اور روشن سمت دے چکے تھے، چنانچہ پاکستان میں عارضی قیام کے دوران انھوں نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اپنے وطن پاکستان واپس نہیں آ سکیں گے اور یہاں کی مٹی اور معاشرت سے خود کو ہم آہنگ نہ کر سکیں گے۔ انفرادی آزادی اور جمہوریت کی کھلی فضا میں سانس لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اب اس حبس زدہ معاشرے میں خود کو ان فٹ محسوس کریں گے جس کی معاشرت اور روایت کے بارے میں خود انھوں نے ہی کہا تھا:

7: سچ اپنا اپنا: ص: 39

اس درجہ روایات کی دیواریں اٹھائیں
نسلوں سے کسی شخص نے باہر نہیں دیکھا

پاکستان سے واپسی کے بعد خالد سہیل نے کناڈا کو ہی اپنا وطن بنالیا۔ نیو برنزوک کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور ٹورنٹو سے کچھ میل کی دوری پر ایک شہر وھٹبی (Whitby) میں آبسے۔ اب 1984ء سے خالد سہیل وھٹبی میں قیام پذیر ہیں، وہاں ان کا ایک ذاتی کلینک (Creative Psychotherapy Clinic) ہے جہاں وہ نفسیاتی مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔ ماہنامہ 'شاعر' ممبئی نے اگست 2006ء کے شمارے میں خالد سہیل پر ایک گوشہ شائع کیا تھا جس میں 'شاعر' کے ایڈیٹر کے چند سوالوں کا جواب دیتے ہوئے خالد سہیل نے اپنی موجودہ زندگی کے بارے میں مندرجہ ذیل الفاظ رقم کیے تھے:

ان دنوں میں کناڈا میں ایک پرسکون زندگی گزار رہا ہوں۔ دن کو مریضوں کا علاج کرتا ہوں اور شام کو رفیق سلطان، زہرا نقوی، عسکری نقوی، ڈینس آئزک اور رشید ندیم جیسے دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا ہوں۔ ہر اتوار کو رفیق سلطان کے ہاں 'درویشوں کے ڈیرے' پر دوست جمع ہوتے ہیں اور ادب اور فلسفے پر گفتگو ہوتی ہے۔ میں اپنی اور دوستوں کی تخلیقات اپنے دوست صلاح الدین پرویز کو بھیج دیتا ہوں جو انھیں میری ویب سائٹ www.drsohail.com پر لگا دیتے ہیں اور ساری دنیا سے دوست مجھے اپنے تاثرات، میرے ای میل ایڈریس welcome@drsohail.com پر بھیجتے رہتے ہیں۔

ایک لکھاری ہونے کے ناطے میرا آدرش اپنے سچ کو تلاش کرنا اور اس سچ کا تخلیقی اظہار کرنا ہے اور ایک ماہر نفسیات ہونے کی وجہ سے میرا مقصد خدمتِ خلق کرنا ہے تاکہ انسانوں کی نفسیاتی مسائل کم ہوں اور وہ ایک صحت منداور پرسکون زندگی گزار سکیں۔ میں ساری دنیا کے انسانوں کی

انفرادی اور اجتماعی زندگی کے امن کے خواب دیکھتا رہتا ہوں۔[8]

خالد سہیل نے جس قسم کے سماج میں آنکھیں کھولیں اور شعور کے میدان میں قدم رکھا، وہ مشرقی روایات اور اقدار کے حصار میں قید تھا۔ سائنس، عقل پرستی اور روشن خیالی کی برکتوں سے ناآشنا تھا۔ فرد کی آزادی ایک بے معنی لفظ تھا، جمہوری اقدار، جمہوری نقطۂ نظر اور آزادانہ رائے کا تصور، گمرہی اور مذہب سے بے گانگی اور بغاوت کے مترادف الفاظ تھے۔ حالانکہ ان کے خاندان میں سائنس پرستی اور مذہبی روشن خیالی کی ایک روایت موجود تھی۔ ان کے دادا ایک آزاد خیال اور لبرل آدمی تھے، چچا عارف عبدالمتین سائنس کے استاد، پاکستان کے مشہور شاعر اور انقلابی ذہن رکھتے تھے۔ ان کی کتابوں نے خالد سہیل کی ذہنی پرورش و پرداخت میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ خالد سہیل کے ابو خالد عبدالباسط ایک بیدار مغز اور کھلے دل دماغ کے مالک تھے۔ ان سبھی نے خالد سہیل کے معصوم ذہن پر اپنے اپنے اثرات مرتب کیے تھے اور یہ ایک اہم وجہ تھی کہ ایک محصور معاشرے کا فرد ہونے کے باوجود انھوں نے ہمیشہ سائنسی اور معروضی اندازِ نظر اپنایا۔ وہ روایتوں اور دقیانوسیت کے آسیب سے محفوظ تھے۔ روایت پرستی اور توہم پرستی کو کبھی بھی انھوں نے اپنا شعار نہیں بنایا۔ روایت شکنی، ان کے دل و دماغ میں اس قدر سرایت کر گئی کہ رفتہ رفتہ بغاوت کی شکل اختیار کرنے لگی۔

روایت سے بغاوت کا جذبہ اس قدر شدید ہوا کہ خالد سہیل نے خود کو روایتی شادی کے بندھنوں سے بھی آزاد رکھا۔ اس وقت ان کی عمر پچپن برسوں سے کچھ متجاوز ہو گی لیکن ابھی تک وہ خانگی اور روایتی طرزِ زندگی کے بکھیڑوں سے آزاد ہیں، آگے کی کس کو خبر؟ لیکن خالد سہیل تجرد کی زندگی بھی نہیں گزارتے، وہ مغربی طرزِ زندگی اور اس کے آزاد ماحول کی برکتوں سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔ اپنی خودنوشت میں انھوں نے رومانوی زندگی کے نشیب و فراز اور شب و روز کی کہانی بڑی صاف گوئی اور بے باکی سے سنائی ہے۔ اس ضمن میں ان کا مضمون بعنوان 'عورت سے رشتہ' ایک دل چسپ مضمون ہے۔ پروفیسر قمر رئیس اور ف۔س۔ اعجاز کی درخواست پر یہ مضمون

---

8. ماہنامہ شاعر: اگست: 2006ء، ص: 19

قلم بند کیا گیا تھا جب وہ 'انشا' رسالے کا 'ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ' نمبر ترتیب دے رہے تھے۔
اس مضمون کا ماحصل یہ ہے کہ خالد سہیل صنفِ نازک سے رشتے استوار کرنے میں بے حد آزاد خیال واقع ہوئے ہیں، وہ مذہب اور سماج کی بندشوں اور اس کے بندھے بندھائے اخلاقی معیار کی پرواہ نہیں کرتے، وہ ایک آزاد پنچھی ہیں جو ہر شاخ پر چہکتا ہے۔ وہ مصری کی ڈلی کی مکھی ہیں شہد کی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رومانوی زندگی رنگا رنگ اور بھرپور رہی ہے، متحرک اور جان دار رہی ہے، مضبوط اور توانا رہی ہے۔ فی الحال ایک کنیڈین خاتون بے ٹی ڈیوس، زندگی کے نشیب و فراز میں ان کی ہم سفر ہیں، مشرق کے روایتی بندھنوں اور اخلاقی بندشوں سے یکسر آزاد؛ ان کا رشتہ پچیس برسوں پرانا ہے۔ خالد سہیل لکھتے ہیں:

> ......مجھے اس کی دوستی اور محبت سے اخلاص کی بو آتی ہے۔ ہمارا رشتہ غیر روایتی ہے، وہ میری بیوی اور منکوحہ ہونے کی بجائے دوست اور محبوبہ ہے۔ ہمارے نظریات مختلف ہیں لیکن ہم ایک دوسرے کے جذبات، خیالات اور نظریات کا احترام کرتے ہیں۔ میں خدا اور مذہب پر یقین نہیں رکھتا لیکن وہ خدا اور روحانیت پر یقین رکھتی ہے۔[9]

بے ٹی ڈیوس، صرف خالد سہیل کی شریکِ سفر ہی نہیں ہیں بلکہ ایک تخلیقی اور ادبی ذہن کی مالک بھی ہیں۔ خالد سہیل کی طرح وہ بھی نفسیات کی طالبِ علم رہی ہیں۔ خالد سہیل کہتے ہیں کہ وہ ایک ایسی دوست اور محبوبہ ہے جس سے میں زندگی کے تمام موضوعات پر کھل کر بات کر سکتا ہوں۔ ہم لوگ ادب، مذہب، سائنس، فلسفہ، جنس اور نفسیات غرضیکہ ہر موضوع پر اپنا اپنا نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ حال میں ہی دونوں نے مل کر خطوط کی شکل میں ایک کتاب مکمل کی ہے جس کا نام Love, Sex and Marriage ہے، اس کے علاوہ ایک کتاب The Art of Working in Your Green Zone دونوں کی مشترکہ کوششوں کا ثمرہ ہے۔

---

9. سچ اپنا اپنا: ص: 50

ادبی اور تخلیقی ارتقا

کسی بھی انسان کی زندگی اور اس کی شخصیت کو خط وخال اور واضح نقوش دینے میں ماحول اور معاشرے کا کردار اہم ہوتا ہے۔ انسان، معاشرے کی قدروں کو تسلیم کرے یا ان سے بغاوت کرے، وہ رسوم و قیود کا احترام کرے، ان سے بے پروائی برتے یا یکسر نظر انداز کر دے؛ کچھ حد تک یہ اس کا ذاتی عمل ہو سکتا ہے لیکن غیر ارادی اور غیر محسوس طریقے پر پورا معاشرہ اور سماج اس شخص کی تعمیر و تشکیل میں اپنا رول ادا کرتا ہے، یہ بات تسلیم شدہ ہے۔ یہ اصول اور ضابطے ایک عام شخص کی بہ نسبت ادیبوں، شاعروں، سائنس دانوں، مفکروں اور تخلیقی کام کرنے والوں پر زیادہ صادق آتے ہیں، چونکہ وہی سماج اور معاشرہ، جوان کو بے اطمینانی اور بغاوت کی دنیا میں لے جاتا ہے اور ہر چیز اور روایت کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھنے اور پرکھنے کا شعور دیتا ہے دراصل اس شعور کی دھار کو تیز کرنے کے لیے خام مواد بھی تو یہی معاشرہ عطا کرتا ہے۔ اس لیے سماج، گرد و پیش، گھر، خاندان، کنبہ، دوست احباب، شہر اور گاؤں یہ سب مل کر شخصیت کے عناصرِ ترکیبی کو ترتیب دیتے ہیں۔

خالد سہیل نے بھی اپنے بچپن کے ایام جس طرح کے معاشرے میں بسر کیے وہ مشرق کی روایتوں میں ڈوبا ہوا سماج تھا۔ اس سماج کے گرداگرد مذہبی روایات، ضعیف الاعتقادی، توہمات اور بے جا رسوم و رواج کی اتنی دیواریں حائل تھیں کہ عقیدوں کے شہر میں رہنے والے انسانوں کو دیواروں کے پار کی دنیا نظر ہی نہ آتی تھی اور اگر کوئی سرپھرا ان پامال راہوں سے ہٹنے کی کوشش کرتا یا ان دیواروں میں نقب لگانے کی تدبیر نکالتا تاکہ باہر کی روشنی اور اجالا شہر کے لوگوں کو بھی میسر آسکے تو سماج اور مذہب کے ٹھیکیداروں کی پیشانی پر بل آجاتے اور اس شخص کو باغی، گمراہ، اور سماج دشمن بنا دیا جاتا۔ اس معاشرے میں تعلیم سے دل چسپی بے حد کم تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ روایات اور توہمات نے سماج کی گہرائیوں تک اپنی جڑیں جمائی تھیں۔ مذہبی، نسلی اور علاقائی تعصب کے جراثیم، روایتوں کے آسیب، رسم و رواج کے شیطان اور ضعیف الاعتقادی اور توہمات کے عفریت اپنا آشیانہ وہیں بناتے ہیں جہاں تعلیم کی رسائی نہ ہو سکتی ہو۔

یہ بات خالد سہیل کے حق میں جاتی تھی کہ ان کے معاشرے پر مشرقی روایات و اقدار اور پامال عقیدوں کی حکمرانی تھی لیکن خوش قسمتی سے ان کے گھر میں علمی ماحول تھا۔ ان کے دادا کی آزادخیالی اور جمہوری قدریں، چچا عارف عبدالمتین اور والد عبدالباسط کی رگوں میں خون بن کر دوڑتی تھیں۔ آزادخیالی اور جمہوری قدروں کی یہی روایت ان کے شعور کا حصہ بنیں۔ اور جب خالد سہیل نے بھی شعور کی وادی میں قدم رکھا تو آزادخیالی، کھلے دل ودماغ اور آزادمنشی کی خصوصیات سنبھالے ہوئے اپنی شخصیت کی تشکیل کرنے لگے۔ ایک اور بات جس نے خالد سہیل کو سماج کی آلودگیوں سے محفوظ رکھا، یہ تھی کہ ان کے والد سرکاری ملازم ہو کر وطن سے دور، پاکستان کے سرحدی علاقے کوہاٹ میں جا آباد ہوئے تھے، وہاں خالد سہیل تھے ان کی چھوٹی بہن عنبرین کوثر تھیں، اور والدین تھے۔ گویا خالد سہیل کی فیملی ایک نیوکلیر فیملی تھی، انھیں مشترکہ خاندان میں رہنے کے مواقع بہت کم حاصل ہوئے، ان کے والد کالج میں استاد تھے، اس لیے گھر میں علمی ماحول تھا، پڑھنے لکھنے اور سیکھنے کے بہتر مواقع تھے۔ ان کی والدہ بہت پڑھی لکھی خاتون تو نہ تھیں لیکن تعلیم سے بے حد لگاو رکھتی تھیں اور اپنے بچوں میں علم کی آگ روشن کرنا چاہتی تھیں۔ ان سب حالات اور اتفاقات نے کچھ یوں گل کھلایا کہ بچپن سے خالد سہیل نے کتابوں کی دنیا سے اپنا تعلق استوار کرلیا۔ لفظوں سے ان کی دوستی بچپن میں ہی ہوگئی تھی۔ وہ ابھی پرائمری درجات میں تھے کہ ان کے والد ان کی خاطر بچوں کی کتابیں اور رسالے لایا کرتے۔ کتابوں کے مطالعے سے ان کے اندر کے تخلیق کار نے نئی نئی کہانیاں سوچنی شروع کردی تھی۔ جب خالد سہیل مڈل اسکول میں داخل ہوئے تو والد صاحب نے 'تذکرۃ الاولیا' لا کردی۔ اس میں درویشوں، صوفیوں اور فقیروں کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر وہ محظوظ ہوتے رہے۔ ایک کہانی سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ ایک مضمون لکھ ڈالا، یہ کہانی مشہور صوفیہ رابعہ بصری کے بارے میں تھی۔ خالد سہیل نے رابعہ بصری پر جو مضمون قلم بند کیا تھا وہ بچوں کے رسالے 'بچوں کی دنیا' میں شائع ہوا۔ مضمون کی اشاعت نے خالد سہیل کو خوشی اور مسرت کے ساتھ ساتھ حوصلہ، ہمت اور اعتماد کے لطیف احساس سے ہم کنار کیا۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ خالد سہیل نے کتابوں سے اپنا رشتہ باقی رکھا اور وہ مستقل مطالعے میں منہمک ہو گئے۔ اس کی شروعات ان کے والد کی چھوٹی سی لائبریری سے ہوئی، لائبریری میں مختلف موضوعات پر بہت ساری کتابوں کے علاوہ شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات بھی مطالعے میں رہیں۔ اپنے چچا عارف عبدالمتین سے خالد سہیل کا ذہنی رشتہ اسی لائبریری میں استوار ہوا اور وہ ان کی تخلیقات سے روحانی فیض حاصل کرنے لگے۔ ان تخلیقات نے خالد سہیل کے ذہن پر دیرپا نقوش ثبت کیے۔ یہ ایک دل چسپ بات ہے کہ عارف عبدالمتین سے خالد سہیل کا رشتہ کتابوں کی وساطت سے ممکن ہوا۔ ہائی اسکول تک آتے آتے خالد سہیل نے پشاور کی چھوٹی بڑی لائبریریوں کی ممبر شپ لے لی تھی اور ان میں ادب، فلسفہ، مذہب اور نفسیات کی کتابوں کا مطالعہ پوری توجہ، انہماک اور دل چسپی سے کیا اور ان علوم کی روح کو اپنے اندر جذب کرنے کی سعی کرتے رہے۔

اس دوران سیکڑوں کتابیں ان کی نگاہوں سے گزر چکی تھیں۔ جن اہم مصنفین، شاعروں اور ادیبوں کی نگارشات سے وہ مستفید ہوئے ان میں فیضؔ، ساحر، احمد فرازؔ، جوشؔ، ناصر کاظمی، منٹو، کرشن چندر، بیدی، غلام عباس، آغا حشر، امتیاز علی تاجؔ، کارل ینگ، الفریڈ ایڈلر، ابوالاعلیٰ مودودی، غلام احمد پرویز، اقبالؔ اور ابوالکلام آزاد شامل تھے۔ خالد سہیل نہ صرف ان ادیبوں اور مفکرین کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے تھے بلکہ اپنے والد صاحب اور دوست واحباب سے زندگی کے اہم مسائل اور کائنات کے سربستہ رازوں کے بارے میں مکالمے اور بحثیں بھی کرتے رہتے تھے۔

خالد سہیل کے ادبی سفر کا باقاعدہ آغاز 1970ء سے ہوا تھا۔ انھوں نے پہلا افسانہ 'دست بوسی' تخلیق کیا تھا اس وقت وہ ایڈورڈز کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ افسانے کا بنیادی موضوع مولویوں کی منافقت تھا۔ مولوی، جو مذہبی معاشرے کی ایک اہم علامت ہے اس افسانے میں اس کی بدکرداری، سیاہ باطنی اور منافقت کو اجاگر کیا گیا تھا۔ اس پہلے افسانے نے مستقبل کے لیے ان کی راہیں تقریباً متعین کر دی تھیں۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ ایک نئے ڈگر کے راہی ہیں، وہ اپنا راستہ شاہراہوں کی بجائے پگڈنڈیوں پر تلاش کر رہے تھے۔ کالج

کی میگزین میں ان کا ایک اور مضمون شائع ہوا تھا، یہ منٹو کے بارے میں تھا۔ ایک روایت شکن اور باغی افسانہ نگار کے فن پر ایک دوسرے باغی اور روایت شکن مضمون نگار کی تحریر یقیناً دل چسپی سے خالی نہ ہوگی۔

ایک طرف خالد سہیل اسکول اور کالج کی تعلیمی منزلوں سے گزرتے رہے اور دوسری طرف اپنی تخلیقی نشو ونما اور خلاقانہ صلاحیتوں کو دھار دیتے رہے۔ جب میڈیکل کالج میں ان کا داخلہ ہوا تو دوستوں کے ساتھ مل کر 'اخوان الشیاطین' نام کی ایک ادبی تنظیم بنائی جو کثرت استعمال سے 'اخوان' رہ گئی تھی۔ تنظیم میں چھ ممبر تھے تین شاعر، ایک موسیقار، ایک کارٹونسٹ اور ایک کرکٹر؛ اس دور میں خالد سہیل کی طبعی میلان افسانہ نگاری کی بہ نسبت شاعری کی طرف زیادہ تھا اور خوش گوار ماحول میں لڑکیوں سے شاعرانہ چشمک رہا کرتیں۔

خیبر کالج کے ہی ایک مشاعرے میں انھوں نے اپنی مشہور نظم 'سرخ دائرہ' سنائی تھی۔ 'سرخ دائرہ' کا موضوع نیا تھا۔ اس موضوع پر احمد فراز جیسے شاعر نے اردو میں کوئی نظم نہیں پڑھی تھی۔ نظم سننے کے بعد، احمد فراز نے خالد سہیل کو مشفقانہ مشورہ دیا کہ لیبر روم کے تجربات و مشاہدات اور عورتوں کے مسائل کے بارے میں نظمیں تخلیق کرتے رہو، یہ اردو ادب میں ایک اضافہ ہوں گی۔ ماضی میں اسی طرح کے کچھ مشوروں سے عارف عبدالمتین بھی نواز چکے تھے۔ اسی سال میڈیکل کالج کے میگزین 'سینا' میں ان کا افسانہ 'بوسہ' اشاعت پذیر ہوا، یہ افسانہ نرسوں کی زندگی اور ان کے پیشے کی کچھ جذباتی پہلوؤں کا احاطہ کرتا تھا۔ امید کے برخلاف اس افسانے کا ردعمل بہت تلخ رہا۔

'دست بوسی'، 'سرخ دائرہ' اور 'بوسہ' جیسی تخلیقات کے اشاعت پذیر ہونے کے بعد خالد سہیل نے روایت شکنی کی ایک اور مثال قائم کی۔ اس سال وہ کالج میگزین 'سینا' کے اردو سیکشن کے مدیر تھے۔ اردو کے لیے مخصوص سو صفحات کے لیے نظمیں، غزلیں اور افسانے تو خاصی تعداد میں موصول ہوئے لیکن کسی سنجیدہ موضوع پر کوئی مضمون یا مقالہ دستیاب نہیں ہوا۔ اس کے لیے خالد سہیل نے اپنے ایک احمدی دوست عبدالوحید کی مدد لی اور مرزا غلام احمد کے بارے میں

ایک مضمون قلم بند کرایا۔ خالد سہیل نے میگزین کی روایت میں ایک اور تبدیلی یہ کی کہ ابھی تک میگزین کی خالی جگہوں پر قرآنی آیات اور احادیث کے ٹکڑے نقل کیے جانے کی روایت تھی۔ انھوں نے آیاتِ قرآنی اور احادیث کی جگہ بڑے بڑے فلسفیوں، ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور سیکولر شخصیات کے اقوال چھاپے جن میں سقراط، افلاطون، برٹنڈ رسل، سگمنڈ فرائڈ جیسے مفکر اور ادیب نمایاں طور سے شامل تھے۔ خالد سہیل نے اس اقدام کے ردِ عمل کا ذکر ایک جگہ اس انداز سے کیا ہے:

> 'سینا' چھپ کر آیا تو جہاں غیر روایتی طلبا بہت خوش ہوئے وہیں شدت پسند روایتی طلبا اتنے برہم ہوئے کہ غصے میں آکر بہت سے 'سینا' کے رسالے احتجاجاً جلا دیے۔ اس واقعہ سے مجھے آزادیٔ افکار و گفتار کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ مجھے آہستہ آہستہ اندازہ ہو گیا کہ میرے غیر روایتی خیالات اور نظریات میرے روایتی ماحول کے ساتھ ایک اہم تضاد کا شکار ہیں جس کا انجام پاگل خانہ یا جیل ہو سکتا ہے۔[10]

1977ء میں خالد سہیل پاکستان سے ایران چلے گئے، وہاں ان کا قیام ڈیڑھ دو برس رہا، اس کے بعد کینیڈا کے مختلف شہروں اور صوبوں میں نفسیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں کچھ وقت گزارا اور آخر کار 1984ء میں موجودہ پڑاو وھٹبی میں منتقل ہو گئے۔ 1977ء سے 1984ء تک کا دور، ادبی اور تخلیقی لحاظ سے خشک سالی کا دور تھا۔ اس دوران ان کا مطالعہ تو برابر جاری رہا اور کچھ تخلیقات بھی عمل میں آئیں۔ چکی کی مشقت کے ساتھ مشقِ سخن بھی جاری رہی لیکن اس کے اظہار کے مواقع میسر نہیں تھے۔ خالد سہیل کے تخلیقی مزاج کو پرواز اس وقت ملی جب وہ اپنے ایک دوست کے مشورے سے ٹورنٹو سے کچھ دور وھٹبی میں آبسے۔ ٹورنٹو میں ایشیائی مہاجروں کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ اس شہر نے نہ صرف ان کو لکھنے پڑھنے اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے مہمیز کیا بلکہ ایشیائی مہاجروں، افریقی نسل کے لوگوں، عورتوں اور بچوں کے مسائل

---

10. سچ اپنا اپنا: ص: 54

کو نزدیک سے جاننے اور سمجھنے کا موقع بھی فراہم کیا۔ اس طرح ٹورنٹو نے انھیں خام مواد بھی دیا اور تخلیقات کو شائع کرنے کرانے کا انتظام بھی کیا۔ یہیں سے خالد سہیل کا تعارف ادبی دنیا سے ایک شاعر اور افسانہ نگار کے طور پر ہوا۔ ٹورنٹو منتقل ہو جانے کے بعد خالد سہیل کی ملاقات دو ایسے لوگوں سے ہوئی جنھوں نے ادبی خضرِ راہ کا کام کیا۔ ایک تھے پاکستان سے ہجرت کر ٹورنٹو میں مقیم ہونے والے ادیب اور مدیر اشفاق حسین، اور دوسرے ہندوستان کے شہر کلکتے سے تعلق رکھنے والے جاوید دانش، جو اس وقت کنیڈا میں مقیم ہیں اور ڈرامہ نگاری کرتے ہیں۔ تخلیقی اور ادبی سطح پر یہ رشتہ اتنا مضبوط ثابت ہوا کہ خالد سہیل نے اشفاق کے ساتھ مل کر ان کے رسالے 'اردو انٹرنیشنل' میں کام کیا اور اشفاق حسین نے خالد سہیل کی شاعری کے مجموعے 'تلاش' اور افسانوی مجموعہ 'زندگی میں خلا' کو نہ صرف زیورِ طبع سے آراستہ کیا بلکہ اپنے رسالے کی معرفت ساری اردو دنیا میں ان کو متعارف کرانے کا فرض بھی ادا کیا۔ اس طرح اشفاق حسین نے خالد سہیل کی شناخت قائم کرنے میں مدد کی۔ خالد سہیل نے جاوید دانش کے ساتھ مل کر کئی کتابیں مرتب کیں۔ ان میں کچھ تو عالمی ادب کے تراجم تھے اور کچھ تخلیقی رنگ لیے ہوئے تھے۔ جاوید کی ہمراہی میں خالد سہیل نے اپنے افسانوں کا آڈیو کیسٹ 'چنگاریاں' اور دوسرا پروجیکٹ اردو نظموں کا کیسٹ 'تازہ ہوا کا جھونکا' مکمل کیا۔ عالمی ادب کے تراجم میں 'ایک باپ کی اولاد'، 'کالے جسموں کی ریاضت' اور 'ورثہ' جیسی تخلیقات وجود میں آئیں۔ ان کتابوں نے ایک ادیب، ایک افسانہ نگار اور ایک شاعر کی حیثیت سے خالد سہیل کی شناخت قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ہر ادیب، شاعر اور قلم کار کے ذہن میں ایک خواب، ایک سپنا پرورش پاتا رہتا ہے کہ اس کی تخلیقات نصابِ تعلیم کے ذریعہ طلبہ کے دل و دماغ تک رسائی حاصل کر سکیں۔ اس بات کی صداقت کو بھی جانتے اور تسلیم کرتے ہیں کہ طلبہ کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں نصابِ تعلیم سب سے کارگر اور موثر حربے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ طلبہ ہی کسی قوم اور ملک کے مستقبل کے ضامن اور امین ہوتے ہیں اگر ان کی تعمیر میں مصنف کے خیالات و نظریات کچھ

کردار ادا کر سکیں تو یہ مصنف کے ادبی اور تخلیقی نظریات کی فتح ہوتی ہے اور مصنف کو اپنی تخلیق کا مقصد بڑی حد تک حاصل ہو جاتا ہے۔ خالد سہیل نے بھی یقیناً یہ سپنا، یہ خواب دیکھا ہوگا۔ خوش قسمتی سے ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر بھی ہوا اور خالد سہیل نے اس خوش گوار تجربے کو محسوس بھی کیا ہوگا۔ یہ ان کے لیے اعزاز اور فخر کی بات ہے کہ ان کی تخلیقات کو نصابِ تعلیم کا حصہ بننے کا شرف حاصل ہوا۔ وہ اس خوبصورت اور خوش گوار احساس سے دو دو مرتبہ دوچار ہوئے۔ اپنی خودنوشت میں وہ لکھتے ہیں:

> جب میں نے اپنی تخلیقات کا انگریزی میں ترجمہ کروا کر چھپوایا تو مجھے شمالی امریکہ کے مختلف اداروں سے خط آئے جن میں سے دو قابلِ ذکر ہیں۔ مجھے ایک خط نیلسن کنیڈا (Nelson Canada) کے دفتر سے آیا جو کنیڈا کے ہائی اسکولوں کے لیے کتابیں چھاپتے ہیں۔ انھوں نے عالمی فکشن کی کتاب 'گلوبل سفاری' (Global Safari) میں میرا افسانہ 'جزیرہ' شامل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ کتاب چھپ کر آئی تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب میں نے اپنا نام چیکوف، ہنرک بول اور نادین گورڈیمر کی فہرست میں دیکھا۔ پھر مجھے شکاگو سے خط آیا کہ جینیرک انسٹی چیوٹ (Generic Institute) ایک کتاب چھاپ رہا ہے جس میں سات شاعر شامل ہوں گے اور وہ میری پانچ نظمیں چھاپنا چاہتے ہیں۔ کتاب کا نام 'سات فرشتے' (Seven Angels) رکھا گیا تھا۔ میں اس حقیقت پر بہت ہنسا کہ ایک دہریے کی نظمیں فرشتوں کے نام سے چھپ رہی ہیں۔[11]

---

11. سچ اپنا اپنا: ص: 58

تصنیف و تالیفات

خالد سہیل ایک مصروف ڈاکٹر، معالج اور ماہر نفسیات تو ہیں ہی ایک ہمہ جہت فن کار اور ادیب بھی ہیں۔ وہ شاعری بھی کرتے ہیں، افسانہ نگاری کے اسرار و رموز سے بھی اچھی طرح واقف ہیں اور ناولٹ کے بھی خالق ہیں۔ مضامین بھی لکھتے ہیں، ترجمے کا کام بھی کرتے رہتے ہیں، ڈائری بھی رقم کرتے ہیں اور شاعروں، ادیبوں اور قلم کاروں سے انٹرویوز لینا تو ان کا خاص شغل ہے۔ غرض یہ کہ نثر کا میدان ہو یا شاعری کا، اپنے تخلیقی اظہار کے لیے انھوں نے ہر میدان میں طبع آزمائی کی ہے اور ایک حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ نثر و نظم کی مختلف اصناف میں اپنے تخلیقی جوہر دکھانے کا سلیقہ انھیں آتا ہے۔

تعجب ہوتا ہے کہ ایک ڈاکٹر اور ماہر نفسیات کی مصروف زندگی سے وہ پڑھنے لکھنے کے لیے وقت کیسے نکال لیتے ہیں۔ شاید وہ لمحات کو روک لینے کے فن سے واقف ہیں یا انھیں اپنی مٹھی میں قید کر لینے کا گر جانتے ہوں۔ بہر حال ان کے تخلیقی سرمائے نثر میں بھی موجود ہیں اور شاعری میں بھی، اردو میں بھی انگریزی میں بھی، یہاں تک کہ پنجابی میں بھی۔ خالد سہیل نے اردو زبان میں تو بیس سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں جن میں کچھ تو طبع زاد ہیں اور کچھ ترجمے کی دین ہیں۔ اسی طرح انگریزی زبان میں بھی ان کی اتنی ہی کتابیں شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔

خالد سہیل ایک بسیار نویس اور زود نویس ادیب ہیں۔ 1985ء میں ان کی پہلی تخلیق 'تلاش' زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی تھی۔ ماہنامہ 'شاعر' ممبئی نے اگست 2006ء کے شمارے میں ان پر ایک گوشہ شائع کیا تھا جس میں خالد سہیل کی تصانیف کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے جن کی مجموعی تعداد چونتیس تک پہنچتی ہے اور خالد سہیل ان بھی کتابوں کے یا تو مصنف ہیں یا ان کا قلم شریکِ غالب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تقریباً اکیس برسوں میں چونتیس کتابیں! مقامِ حیرت افزا ہے۔ بقول شخصے ''جتنی کتابیں سہیل نے تخلیق کی ہیں، اتنے خطوط ہم نے نہیں لکھے۔'' اور تادمِ تحریر ان میں اضافہ جاری ہے۔

یہاں خالد سہیل کی تصنیفات وتالیفات کی فہرست دی جارہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے بارے میں ایک عمومی تبصرہ بھی شامل کیا گیا ہے تاکہ ایک عام قاری کو ان کی ہمہ جہت شخصیت کو جاننے اور سمجھنے میں آسانی ہو اور وہ خالد سہیل کی ادبی اور فنی حیثیت کا تعین ایمان داری اور غیر جانب داری سے کر سکے۔

اردو

(1) تلاش (شعری مجموعہ)

خالد سہیل کا مجموعۂ شاعری 'تلاش' کے عنوان سے 1985ء میں طبع ہوا ہے۔ ایک سو بہتر 172 صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں غزلیات، قطعات اور منظومات کو سات الگ الگ عنوانات کے تحت منقسم کیا گیا ہے۔ ہجرت کی وادیوں سے گزرتے ہوئے خالد سہیل اور کائنات کے درمیان جو نیا رشتہ استوار ہوا ہے، 'تلاش' اسی کا استعارہ ہے۔ اس مجموعے میں آپ کو زندگی، انسان، عورت اور اپنے گرد وپیش کی زندگی چلتی پھرتی نظر آئے گی۔ بعض نظموں میں تحلیل نفسی کے عناصر موجود ہیں۔

نظم کے باب میں کہا جا سکتا ہے کہ 'عورت سے رشتہ'، 'دو آوازیں'، 'الفاظ اور ہم' اور 'پیشین گوئی' بہت نفیس نظمیں ہیں اور غزلوں میں خیالات کی تازگی تو ہے مگر لفظیات اور تراکیب کی بندش ڈھیلی ڈھیلی محسوس ہوتی ہے البتہ ان کے اشعار حقیقت پسندی کی خوبیوں سے مالا مال ہیں۔

(2) زندگی میں خلا (افسانوی مجموعہ)

خالد سہیل کو بطور ایک افسانہ نگار متعارف کرانے کا سہرا اس کتاب کے سر باندھنا چاہیے۔ یہ پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو 1987ء میں اشاعت کی منزلوں سے گزر کر منظرِ عام پر آیا اس کے ناشر یو۔آئی پبلشر، ٹورنٹو، کناڈا ہیں۔ اس کتاب کو منظر عام پر لانے کے لیے خالد سہیل

کے ادبی خضرِراہ اشفاق حسین کی کوششوں کا اعتراف ضروری ہے۔ اشفاق حسین کا ایک مضمون بھی شامل کتاب ہے۔ اس مجموعے میں کل سترہ[17] افسانے ہیں جو تارکینِ وطن کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں، کچھ افسانوں میں مقامی باشندوں کے طرزِ حیات کا ذکر ملتا ہے۔ اس کتاب میں ایک طرف مغربی معاشرے کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی کوشش نظر آتی ہے تو دوسری طرف افریقہ کے نسل پرست سماج کے پس منظر میں لکھے گئے چار افسانے پڑھ کر ہم افریقی زندگی کے مسائل سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ خالد سہیل کے بیشتر افسانوں اور تحریروں میں سالِ تحریر درج ہوتا ہے جس سے ان کے ذہنی سفر کے ارتقا کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

(3) بھگوان، ایمان، انسان (ترجمہ)

یہ کتاب مختلف ادیبوں کے مضامین کا ترجمہ ہے، کتاب میں ایک مضمون خود مترجم کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ برٹرینڈ رسل کے دو مضامین، ابراہیم میسلو، سارتر اور ایرک فرام کے ایک ایک مضمون کا ترجمہ شامل کیا گیا ہے۔ خدا، کائنات اور انسان کے بارے میں ان مختلف ادیبوں اور مفکرین کے نظریات کیا تھے، یہ کتاب ان نظریات کو سمجھانے میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ کتاب کے ناشر زاہد لودھی ہیں اور Creative Links, Canada سے 1988ء میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی تھی، کتاب کی ضخامت اٹھہتر[78] صفحات پر مشتمل ہے۔

(4) مغربی عورت: ادب اور زندگی (ترجمہ)

یہ کتاب مغربی خواتین ادیبوں کے افسانوں اور مضامین کے اردو ترجمہ پر مشتمل ہے۔ بنیادی طور سے یہ کتاب تانیثی ادب (فیمی نسٹ ادب) کے زمرے میں آتی ہے۔ Creative Links, Canada نے اس کتاب کو اپنے بینر تلے 1988ء میں شائع کیا ہے۔ کتاب کے صفحات کی مجموعی تعداد ایک سو اڑتیس[138] ہے۔ اس کتاب میں گذشتہ ایک صدی میں متحرک رہنے والی عورتوں کے مضامین، انٹرویوز اور افسانوں کا انتخاب اردو ترجمہ ہے جو عورتوں کے مساوی حقوق کے لیے

چلائی جانے والی تحریک کی بنیاد بنے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصے کا عنوان 'عورتیں اور ادب' ہے جب کہ دوسرے حصے کا نام 'عورتیں اور زندگی' رکھا گیا ہے۔ اس حصے کے عنوانات سے بعض موضوعات کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً عورتیں اور محبت، عورتیں اور زنا بالجبر، عورتیں اور حیض، عورتیں اور ابارشن وغیرہ۔ اس کتاب کے انتساب میں خالد سہیل نے لکھا ''مغربی عورت کا پیغام مشرقی عورت کے نام۔''

(5) ٹوٹا ھوا آدمی (دو ناولٹ)

یہ درحقیقت دو ناولٹ کا مجموعہ ہے جس میں پہلا 'ٹوٹا ہوا آدمی' اور دوسرا 'مقدس جیل' ہے۔ 'ٹوٹا ہوا آدمی' ایک ایسے فرد کی کہانی بیان کرتا ہے جو مشرقی اقدار اور روایات کے بیچ پرورش پا کر جوان ہوتا ہے اور بہتر مستقبل کی تلاش میں اپنے خاندان کے ساتھ مغرب میں جا بستا ہے۔ ایک ماحول سے نکل کر دوسرے نئے ماحول کی ہجرت کرنے اور اس سماج سے خود کو ذہنی اور جذباتی سطح پر ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں کس طرح کے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے، ایک مہاجر کے دل و دماغ میں کس طرح کے تضادات اپنا آشیانہ بنا لیتے ہیں اور اس کی شخصیت شکست و ریخت کی کن کن منزلوں سے گزرتی ہے کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو دیتا ہے۔ یہ ناولٹ مشرق و مغرب کی انھی تہذیبی قدروں کے تصادم اور کشاکش کو اجاگر کرتا ہے۔

اس کے برعکس 'مقدس جیل' مغربی معاشرت میں پلی بڑھی ایک ایسی لڑکی کے ان تجربات کی کہانی ہے جب وہ مشرقِ وسطیٰ کی دولت کی ظاہری چمک دمک سے چندھیا کر سعودی عرب میں نرس کی ملازمت کر لیتی ہے۔ مغربی ماحول کی پروردہ جب کسی مشرقی ماحول کی روایات سے متصادم ہوتی ہے تو اس کی شخصیت اور کردار میں کس طرح کی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں، یہ کہانی اسی جذبے کی عکاسی کرتی ہے۔ گویا 'ٹوٹا ہوا آدمی' میں ایک مشرقی انسان کی آنکھوں سے مغربی معاشرت کی جھلکیوں کو پیش کرنے کی کوشش نظر آتی ہے اور 'مقدس جیل' میں ایک مغربی فرد (وہ بھی عورت) کے دل و دماغ اور نظروں سے مشرقی ماحول اور روایات و اقدار کا احتساب کیا گیا ہے۔

'مقدس جیل'1987ء میں تخلیق ہوئی تھی اور 'ٹوٹا ہوا آدمی'1989ء میں۔ یہ دونوں ناولٹ شارب ردولوی کے پیش لفظ سے آراستہ ہو کر 1990ء میں منظرِ عام پر آئے۔ کتاب کے پبلشر خود خالد سہیل ہیں جسے انھوں نے Creative Links, Canada سے شائع کیا ہے۔ دونوں ناولٹ کے صفحات کی مجموعی تعداد دو سو چالیس[240] ہے۔

(6) کالے جسموں کی ریاضت (ترجمہ)

سیاہ فام ادب پر مشتمل یہ کتاب 1990ء میں شائع ہوئی تھی۔ کتاب کے پبلشر Creative Links, Canada ہیں۔ اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں خالد سہیل اور جاوید دانش نے مل کر کام کیا جس کا مقصد سیاہ فام ادب کو اردو میں منتقل کرا کر اردو قارئین کو سیاہ فاموں کے مسائل و آلام سے روبرو کرانا ہے۔ کتاب میں افریقہ، آسٹریلیا، یورپ اور امریکہ کے سیاہ فام لٹریچر کو منتخب کر ان کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں کہانیاں، افسانے، ڈرامے، خودنوشت اور خطوط غرضیکہ بیشتر اصنافِ ادب کو سمیٹا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اردو قاری، مختلف عالمی عصری مسائل سے روبرو ہوتا ہے۔ کتاب کی ضخامت دو سو انیس[219] صفحات پر مشتمل ہے۔

(7) انفرادی اور معاشرتی نفسیات (نفسیات)

ایک سو نواسی (189) صفحات پر مشتمل یہ کتاب نفسیات کے موضوع پر خالد سہیل کے افکار و خیالات کا اشاریہ ہے۔ یہ 1991ء میں 'سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور' سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں خالد سہیل نے اپنی زندگی کے شب و روز اور گرد و پیش کو موضوع بنا کر اپنے نظریات و خیالات کو تحریری شکل میں ڈھالا ہے۔ کسی شہر، ملک یا سماج سے جب کوئی آبادی نقل مکانی کرتی ہے تو انھیں کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی طور سے وہ کس قسم کے امتحانات سے گزرتی ہے یہ کتاب انھیں آزمائشوں، تجربوں، بنتی بگڑتی خاندانی تصویروں اور ایک کلچر سے دوسرے کلچر کی طرف ہجرت کرنے اور نئے کلچر میں مدغم ہوجانے کی کہانی

نفسیات کے نقطۂ نظر سے بیان کرتی ہے۔

(8) امن کی دیوی (خلیجی جنگ کے پس منظر میں لکھی گئی تحریر)

اسی نام سے خالد سہیل نے ایک افسانہ بھی تخلیق کیا تھا۔ یہ کتاب مشرقِ وسطیٰ اور خلیجی جنگ 91-1990ء کے پس منظر میں لکھی گئی ہے اور عالمی سطح پر رونما ہونے والی سیاست اور اس کی پیچیدگیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ دو سو چھیانوے[296] صفحات پر مشتمل یہ کتاب گورا پبلشرز، پاکستان نے شائع کی ہے۔ سنہ اشاعت 1992ء درج ہے۔

(9) آزاد فضائیں (شاعری)

خالد سہیل کی شاعری کا یہ دوسرا مجموعہ 1993ء میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ اس کے صفحات کی تعداد ایک سو چوراسی[184] ہے اور گورا پبلشرز، پاکستان نے اسے شائع کیا ہے۔

(10) ورثہ (لوک کہانیاں)

یہ کتاب بھی خالد سہیل اور جاوید دانش کی مشترک کوشش کا نتیجہ ہے۔ عالمی لوک کہانیوں کے اردو ترجمے پر مشتمل یہ کتاب گورا پبلشرز، پاکستان نے 1993ء میں شائع کی تھی جس کے صفحات کی مجموعی تعداد ایک سو بتیس[132] تھی۔

(11) دو کشتیوں میں سوار (افسانوی مجموعہ)

کتاب کا نام مجموعے میں شامل ایک افسانے کے نام پر رکھا گیا ہے۔ یہ مجموعہ 1994ء میں اشاعت پذیر ہوا جس کے پبلشر Creative Links, Canada ہیں۔ غالباً یہ خالد سہیل کا اپنا پبلشنگ بینر ہے۔ اس مجموعے میں کل پندرہ[15] افسانے شامل ہیں۔ تقریباً تمام افسانوں کے اخیر میں تاریخِ تخلیق درج ہے۔ یہ مجموعہ بھی خالد سہیل کے ذہنی اور فکری نظریات کا ترجمان ہے جس میں ان افراد کی ذہنی کشمکش کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے جو اپنا وطن چھوڑ کر مغربی ممالک میں

جا آباد ہوئے ہیں۔اس کتاب کا پیش لفظ مشہور فکشن رائٹر جوگندر پال نے لکھا ہے۔

(12) ایک باپ کی اولاد (عرب اور یہودی ادب)

مشہور ڈرامہ نگار جاوید دانش کے ساتھ مل کر خالد سہیل نے کئی تخلیقی کام سرانجام دیے ہیں۔ یہ کتاب بھی دونوں قلم کاروں کی مشترکہ کوششوں کا ثمرہ ہے۔ یہ کتاب عرب اور اسرائیلی ادیبوں کی تخلیقات کا اردو ترجمہ ہے۔ کتاب کا نام تلمیحی انداز میں رکھا گیا ہے۔ ,Creative Links Canada نے یہ کتاب اپنے پبلشنگ ہاؤس سے شائع کی ہے۔ سنہ اشاعت معلوم نہ ہوسکا۔

(13) ہر دور میں مصلوب (ہم جنس پرستی کے ادب پر مشتمل)

یہ کتاب ہم جنس پرستی کے موضوع پر تحریر کی گئی ہے۔ یہ کتاب گے اور لیسبین ادب کے تراجم پر مشتمل ہے۔ اور ہندوستان کے شہر کولکاتہ سے شائع ہوئی ہے۔ سنہ اشاعت معلوم نہ ہوسکا۔

(14) پگڈنڈیوں پر چلنے والے مسافر (مضامین اور انٹرویوز)

انٹرویوز کرنا خالد سہیل کا خاص شوق ہے وہ اسے ادبی مشغلے کے طور پر برتتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں انھوں نے ان قلم کاروں اور تخلیق کاروں کے انٹرویوز لیے ہیں جو مشرقی ماحول اور گردوپیش میں رہتے ہوئے بھی عام روش سے ہٹ کر اپنی گزرگاہ تلاش کرتے ہیں۔ جو شاہراہوں سے نہیں، چھوٹی چھوٹی اور ناہموار پگڈنڈیوں سے اپنی منزل تک پہنچتے ہیں۔ یہ روایت شکن اور باغی ذہن کے تخلیق کار، طباعی اور خلاقی میں انفرادیت کے مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔

کتابِ مذکور کو خالد سہیل نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ مضامین پر مشتمل ہے جو خود انھی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس حصے میں خالد سہیل نے شاعروں اور ادیبوں کا تنقیدی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیا ہے۔ ایسے شاعروں میں غالب، احمد ندیم قاسمی، فیض، احمد فراز، حبیب جالب، فہمیدہ ریاض اور جوش شامل کیے گئے ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے میں جن تخلیق کاروں کو جگہ دی گئی ہے ان میں شاعر بھی ہیں،

نقاد بھی اور افسانہ نگار بھی۔ شاعروں میں احمد فرازؔ، عارفؔ عبدالمتین اور کشور ناہید کے انٹرویوز ہیں۔ افسانہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے احمد ندیم قاسمی کا اور نقادوں کی حیثیت سے قمر رئیس، گوپی چند نارنگ اور شارب ردولوی کے انٹرویوز شامل کیے گئے ہیں۔ تیسرا اور آخری حصہ تراجم پر مشتمل ہے جس میں کنفیوشس، افلاطون، شوپنہار، کرکیگار اور سارتر کے مضامین کو ترجمے کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ یہ تمام مضامین ادب اور ادیب، شاعری اور سماج جیسے موضوعات سے بحث کرتے ہیں۔ کتاب تقریباً دو سو ساٹھ[260] صفحات کی ضخامت لیے ہوئے ہے۔ مصنف ہی اس کتاب کے ناشر بھی ہیں، سالِ اشاعت 1996ء درج ہے۔

(15) دریا کے اس پار (ناولٹ)

خالد سہیل کا تخلیق کردہ یہ ناولٹ 1997ء میں Creative Links, Canada سے شائع ہوا تھا۔ ایک سو ستانوے[197] صفحات پر مشتمل یہ ناولٹ پختون تہذیب کی عمدہ عکاسی کرتا ہے۔ اس ناولٹ کا بنیادی موضوع عورتوں کی آزادی اور خودمختاری ہے۔ سنبل خان اس کا سب سے اہم اور مضبوط کردار ہے جو پختون نسل کی پڑھی لکھی اور مہذب لڑکی ہے۔ وہ مشرقی طرزِ زندگی سے بغاوت کر مغرب میں جا بستی ہے۔ وہ ایک خوددار اور غیرت مند لڑکی ہے لیکن آزادی کی قیمت پر کسی سے کوئی مصالحت نہیں کرتی۔ پورا ناولٹ پختون کلچر اور اس کے کھوکھلے ایمان و اعتماد کو پیش کرتا ہے اور ساتھ ہی نئے جہانوں کی سیر بھی کراتا ہے۔ کتاب ظہیر انور کے پیش لفظ سے آراستہ ہے۔

(16) دھرتی ماں اداس ھے (افسانوی مجموعہ)

خالد سہیل کی کہانیوں کا ایک اور مجموعہ 'دھرتی ماں اداس ہے' کے نام سے 1997ء میں چھپ کر آیا۔ اس کے پبلشر بھی Creative Links, Canada ہی ہیں۔ اس میں کل سولہ[16] افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ کتاب کے اخیر میں سعید انجم کا ایک مضمون 'عقیدوں کے شہر میں تجربوں کا آدمی' اور جاوید دانش کا تحریر کردہ خاکہ 'ماڈرن درویش یا معمہ' ضمیمے کی حیثیت سے شامل

کتاب ہیں جو خالد سہیل کی تحریروں اور ان کے ذہنی سفر کی مختلف منزلوں سے ہمیں روشناس کراتے ہیں۔ کتاب کے صفحات کی تعداد تقریباً تین سو[300] ہے۔ مجموعے کا نام کتاب میں شامل ایک افسانے کے نام پر رکھا گیا ہے باقی دوسرے مجموعوں کی طرح اس کتاب میں بھی سنہ تحریر درج ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ 1990ء سے 1995ء تک کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

(17) شائزوفیرینیا (نفسیات)

نفسیات، خالد سہیل کا خاص میدان ہے۔ شائزوفیرینیا پر غالباً ان کا یہ کام نقشِ اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے جس میں اس پراسرار بیماری کے خط وخال اور علامات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تشخیص اور طریقۂ علاج کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ شائزوفیرینیا ایک ایسی پراسرار بیماری ہے جس کا مریض ذہنی کرب اور اضمحلال سے دوچار ہوتا ہے۔ اس مرض میں ذہن کے کام کرنے کا ڈھنگ بے ترتیبی کا شکار ہو جاتا ہے جس سے مریض کا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے۔

یہ کتاب 1998ء میں چھپ کر منظر عام پر آئی، ناشر ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ہیں۔ کتاب ایک سو چھیالیس[146] صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

(18) میرے قبیلے کے لوگ (مضامین اور انٹرویوز)

ادیبوں اور شاعروں کا انٹرویو لینا خالد سہیل کا شوق اور مزاج ہے۔ انگریزی اور اردو میں انھوں نے متعدد شاعروں اور ادیبوں کا انٹرویو لیا ہے۔ یہ کتاب بھی ان قلم کاروں کے انٹرویوز پر مشتمل ہے جو مشرق سے ہجرت کر کے مغرب میں آباد ہو گئے ہیں۔ خالد سہیل نے ایسے لوگوں کو 'اپنے قبیلے کے لوگ' کہا ہے کیوں کہ انھوں نے یہ بات متعدد مقامات پر تحریر کی ہے کہ مغرب میں بسنے والے یہی مہاجر اور وہاں کے ہم خیال مقامی باشندے اب ان کے قبیلے کے افراد ہیں۔

اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ انٹرویوز کا ہے اور دوسرے حصے

میں مہاجر ادیبوں اور تخلیق کاروں کے مضامین کو اکٹھا کیا ہے۔ خالد سہیل نے یہ کتاب 'مہاجر پرندوں کے نام' منسوب کی ہے، اس طرح ہمارے دعوے کی توثیق بھی ہوتی ہے کہ اس کتاب میں خالد سہیل نے ان قلم کاروں کو قبیلے کے افراد تسلیم کیا ہے جو ہجرت کے مرحلے سے گزر کر مغرب میں سکونت پذیر ہیں۔

پہلے حصے میں کل پانچ انٹرویوز شامل ہیں۔ یہ انٹرویوز افتخار عارف، اشفاق حسین، حمیرارحمان، نسیم سید اور جاوید دانش کے ہیں۔ دوسرا حصہ مضامین پر مشتمل ہے۔ ایسے کل دس لوگ ہیں جن کے مضامین اس مجموعے میں شامل ہو پائے ہیں، ان کے نام یہ ہیں: اشفاق حسین، افتخار نسیم، ظفر زیدی، فاروق حسن، عابد جعفری، نسیم سید، جاوید دانش، رضاء الجبار، منیرالدین احمد اور سعید انجم۔ کتاب کی اشاعت 1998ء میں عمل میں آئی جس کے ناشر ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ہیں اور صفحات کی مجموعی تعداد چار سو نو[409] ہے۔

(19) مذھب' سائنس' نفسیات (مضامین)

یہ کتاب مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ جسے Creative Links, Canada نے 1998ء میں شائع کیا ہے۔ صفحات کی مجموعی تعداد ایک سو سینتالیس[147] ہے۔

(20) اینا فانل (نفسیات)

نفسیات خالد سہیل کا خاص میدان ہے۔ یہ کتاب اسی موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔ کتاب دو سو تین[203] صفحات کی ضخامت لیے ہوئے ہے اور مشعل بکس پبلشرز، کناڈا اس کے ناشر ہیں۔ یہ کتاب 2003ء میں منظر عام پر آئی۔

(21) خدا' مذھب اور ھیومن ازم (فلسفہ)

یہ کتاب فلسفے کے موضوع پر تصنیف کی گئی ہے۔ نفسیات اور ادب کے ساتھ ساتھ فلسفہ

خالد سہیل کی دلچسپی کا خاص میدان ہے۔ 2005ء میں دو سو چونتیس[234] صفحات پر مشتمل یہ کتاب 'درویشوں کا ڈیرا' کناڈا سے شائع ہوئی ہے۔

(22) سمندر اور جزیرے (شاعری)

خالد سہیل کی شاعری کا تیسرا مجموعہ 'درویشوں کے ڈیرے سے 2006ء میں شائع ہوا۔ کتاب کی ضخامت ایک سو پچھتر[175] صفحات پر مشتمل ہے۔

(23) سماجی تبدیلی :ارتقا یا انقلاب؟

یہ کتاب سیاست کے موضوع پر لکھی گئی ہے اور اسے سٹی بک پبلشرز؛ کراچی، نے گذشتہ سال شائع کیا ہے۔ ضخامت دو سو ترسٹھ[263] صفحات کی ہے۔ اس کتاب میں خالد سہیل کے کچھ طبع زاد مضامین ہیں جس کا ترجمہ ان کے شریک کار ادیبوں نے کیا ہے اور بعض مضامین مغربی ادیبوں، مفکروں اور سیاست دانوں کے ہیں جن کا ترجمہ خالد سہیل کے قلم کا مرہونِ منت ہے۔ مغربی ادیبوں اور مفکروں میں سارتر اور فیڈل کاسٹرو خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

(24) سچ اپنا اپنا (خودنوشت)

یہ کتاب خالد سہیل کی خودنوشت ہے۔ اس کتاب میں خالد سہیل نے اپنے آباواجداد کی جڑوں کو تلاش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کس طرح ان کا خاندان کشمیر سے ہجرت کرتا ہوا پنجاب میں آباد ہوا اور تقسیم کے کرب سے دوچار ہوا۔ کتاب میں زندگی کے مختلف تجربات کا بیان خالد سہیل نے بڑی صفائی، وضاحت اور حقیقت نگاری کے ساتھ کیا ہے۔ یہی اس کی خوبی ہے۔ کتاب دارالشعور پبلشرز، پاکستان سے 2009ء میں شائع ہوئی ہے اس کے صفحات کی مجموعی تعداد تین سو چھتیس[336] ہے۔

(25) نفسیاتی مسائل اور ان کا علاج

یہ کتاب خالد سہیل نے گوہر تاج کے تعاون سے تصنیف کی ہے۔ کتاب کا موضوع نفسیاتی مرض اور مریض ہیں، جو زندگی کی مختلف مسائل کے درمیان توازن قائم کرنے کی جدوجہد میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ کتاب خالد سہیل کی دیگر نفسیاتی کتابوں کی طرز میں لکھی گئی ہیں۔

(26) انسانی شعور کا ارتقا

اس کتاب میں خالد سہیل نے آسمانی آقاؤں اور دیوتاؤں کی اطاعت کو بے کار اور ایک فضول رسم کا استعارہ ثابت کیا' ہے۔ کس طرح سے ایک مخصوص طبقہ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر مذہب کی آڑ میں استحصالی بن گیا ہے، اور مذہب کی روایات سے فائدہ اٹھا کر اپنی خواہشات کی تکمیل کرتا ہے، اسی رویے کو تنقید کی میزان میں پرکھا گیا ہے۔ اور اپنے معروضات کو پیش کرنے کے لیے معروف عقل پسندوں کے افکار وخیالات سے روشنی حاصل کی گئی ہے۔ گویا اس کتاب کے مضامین خالد سہیل کے عالمی انسانی تصورات اور ہیومنزم کے فلسفے کی عکاسی کرتے ہیں، اور ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھتے ہیں جہاں نسل، رنگ، ذات، مذہب اور جنس کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان کوئی امتیاز نہ ہو۔ کتاب سٹی بک پوائنٹ، کراچی نے خاص اہتمام سے شائع کی ہے۔

(27) سراب کا مستقبل (ترجمہ)

مشہور فلسفی اور ماہرِ نفسیات سگمنڈ فرائڈ کی فکر انگیز کتاب (The Future of An Allusion) کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کا سہرا خالد سہیل کے سر جاتا ہے، انھوں نے اس کتاب کی تلخیص بھی پیش کی ہے اور ترجمہ بھی کیا ہے۔ اُس کتاب کا نام ''سراب کا مستقبل'' رکھا گیا ہے۔

(28) القاعدہ، امریکہ اور پاکستان

یہ کتاب عالمی سیاست کے حوالے سے ایک بالکل نئے تجزیے پر مبنی ہے، ایسا خود کتاب کے مصنف کا خیال ہے۔ درحقیقت اس کتاب میں القاعدہ، امریکہ اور پاکستان کے تعلق سے پوری عالمی سیاست کو ایک خاص زاویے سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(29) چند گز کا فاصلہ

افسانوں کا یہ مجموعہ سٹی بک پبلشرز، کراچی نے گذشتہ سال (2012) میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں بھی فکشن کے تعلق سے ایسے افسانے شامل کیے گئے ہیں، جو خالد سہیل کے افکار و خیالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کے بیش تر افسانے انسانیت، انسانی رواداری، امن کی تلاش اور عدمِ مساوات کے خلاف احتجاج کے طور پر تحریر کیے گئے ہیں۔

کتابوں کی اس فہرست کے علاوہ افسانے اور شاعری کا آڈیو کیسیٹ 'چنگاریاں' اور 'تازہ ہوا کا جھونکا' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ اس میں خالد سہیل کے دوست جاوید دانش کی کوششوں کا ذکر خاص طور سے ضروری ہے۔

انگریزی

اردو میں تحریر کی گئی ان کتابوں کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی خالد سہیل نے متعدد کتابیں تصنیف یا تالیف کی ہیں۔ یہاں صرف ان کی فہرست دی جارہی ہے کیوں کہ سردست وہ ہمارے موضوع سے براہ راست تعلق نہیں رکھتیں۔

1. BREAKING THE CHAINS (STORIES) 1989

2. FROM ONE CULTURE TO ANOTHER (ESSAYS) 1990

3. SCHIZOPHRENIA (PSYCHOLOGY) 1991

4. A BROKEN MAN (NOVELLA) 1992

5. LITERARY ENCOUNTERS(INTERVIES WITH IMMIGRANT WRITERS) 1993

6. STRANGERS CARE (GROUP PSYCHOTHERAPY) 1994

7. THERAPEUTIC ENCOUNTERS (PSYCHOTHERAPY) 1995

8. PAGES OF MY HEART (POEMS) 1997

9. GROWING ALONE...GROWING TOGETHER. (PSYCHOTHERAPY) 1998

10. FROM ISLAM TO SECULAR HUMANISN (BIOGRAPHY) 2001

11. THE ART OF LIVING IN YOUR FREEN ZONE (PSYCHOTHERAPY) 2002

12. THE MYTH OF THE CHOSEN ONE

(PSYCHOLOGY OF SERIAL KILLERS) 2002

13. THE ART OF LOVING IN YOUR GREEN ZON

(PSYCHOTHERAPY) 2003

14. THE ART OF WORKING IN YOUR GREEN ZONE

..CO-AUTHOR...BETTE DAVIS (PSYCHOTHERAPY) 2004

15. LOVE, SEX AND MARRIAGE

(LETTERS BETWEEN SOHAIL AND BETTE DAVIS) 2005

16. PROPHETS OF VIOLENCE...PROPHETS OF PEACE (POLITICS) 2005

17. FREEDOM OF RELIGION...FREEDOM FROM RELIGION

(PHILOSOPHY) 2007

18. GREEN ZONE LIVING...7 STEPS TO A HEALTHY, HAPPY AND

PEACEFUL LIFESTYLE, 2008

19. CREATING GREEN ZONE SCHOOLS...THE ART OF LEARNING IN

YOUR GREEN ZONE, 2010

20. THE NEXT STAGE OF HUMAN EVOLUTION...ESSAYS ON

SCIENCE, PSYCHOLOGY AND HUMANISM, 2010

21. MIXED MARRIAGE

22. MOTHER EARTH IS SAD

23.FROM HOLY WAR TO GLOBAL PEACE

ڈاکومینٹری

24. INTIMATE ENCOUNTERS (DOCUMENTARY ON MIXED MARRIAGES) 1995

25. ENCOUNTERS WITH DEPRESSION (DOCUMENTARY ON DEPRESSION) 1997

26. GROWING ALONE, GROWING TOGETHER (DOCUMENTARY ON RELATIONSHIPS) 1999

27. BREAKING THE CYCLE (DOCUMENTARY ON DOMESTIC VIOLENCE) 2003

28. INTERVIEWED FOR CBC CANADIAN BROADCAST (DOCUMENTARY ON ATHEISM AND HUMANISM) 2009

29. INTERVIEWED FOR 13 EPISODES VISION TV CANADA (DOCUMENTARY SERIES 'SACRED EXPLORATIONS' ON RELIGION AND SEX...EPISODE ON SEXUAL FANTASIES) 2010 ANTHOLOGY

30. STORY' ISLAND' INCLUDED IN CANADIAN ANTHOLOGY...GLOBAL SAFARI...WORLD FICTION FOR CANADIAN HIGH SCHOOL STUDENTS

●●

خالد سہیل کے افسانوی ادب کے موضوعات و مسائل
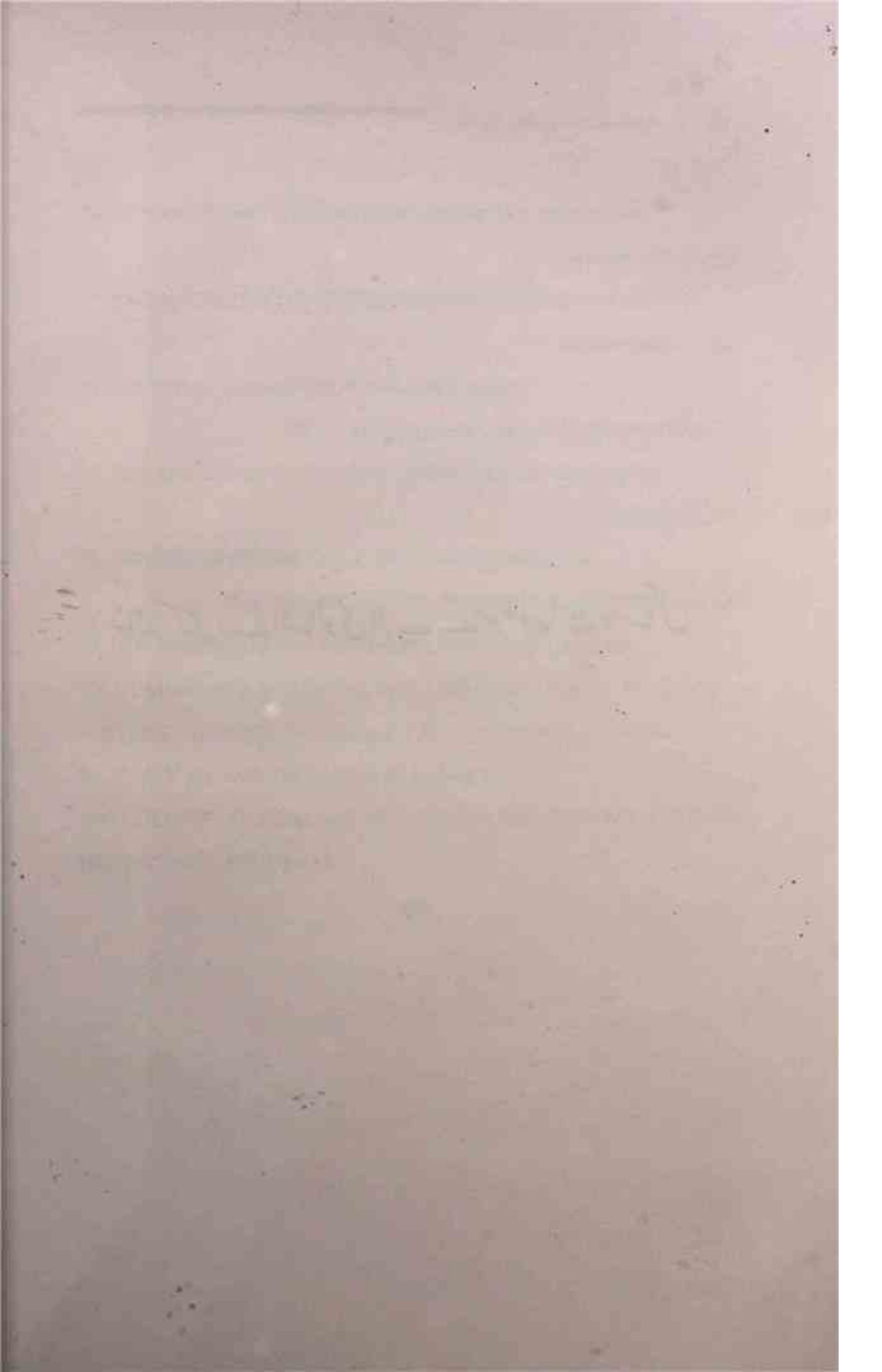
موضوعات و مسائل

گذشتہ باب میں خالد سہیل کی زندگی اور ان کے ادبی اور تخلیقی ارتقا پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس باب میں ہماری کوشش یہ جاننے کی رہے گی کہ خالد سہیل نے اپنی افسانوی کائنات میں بالعموم کس طرح کے موضوعات کو جگہ دی ہے۔ کیا انھوں نے فرسودہ اور پرانے موضوعات میں ہی کچھ نئے گل بوٹے کھلائے ہیں یا موضوعات کی جدت سے اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔

یوں تو اردو فکشن کی دنیا موضوعات کی رنگا رنگی اور تنوع کی خوبیوں سے مالا مال ہے۔ حیات انسانی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جہاں ہمارے ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کے تخیل نے پرواز نہ کی ہو۔ جس طرح موضوعات کی رنگا رنگی اور تنوع کے معاملے میں غزل کا کوئی جواب نہیں اسی طرح نثر کے میدان میں ناول اور افسانہ بے مثل حیثیت رکھتے ہیں۔ کائنات میں بے شمار مظاہر بکھرے پڑے ہیں، قدرتی اشیا، قدرتی مناظر، جان دار اور بے جان اشیا، انسان اور انسانی زندگی کے ہزار رنگ اور ذہن انسانی میں پلنے والے بے شمار جذبات، خیالات اور احساسات؛ انھیں رنگا رنگ اشیا اور مظاہر سے فکشن نگاروں نے موضوعات اخذ کر اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔ زندگی ہر لمحہ رواں دواں ہے، ہر لمحہ بدلتی اور ارتقا پذیر زندگی میں نئے نئے مسائل اور چیلنج کا اضافہ ہوتا رہتا ہے یہی اضافہ اور نئے نئے مسائل افسانوں اور فکشن کا موضوع بن جاتے ہیں۔

جب ہم سرسری طور سے افسانہ نگاری کے موضوعات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات بڑی آسانی سے ثابت ہوجاتی ہے کہ اردو افسانہ نگاروں نے زندگی کے جملہ پہلوؤں سے اپنے موضوعات تلاش کیے ہیں۔ پریم چند نے دیہات کے غریب اور مفلس کسانوں کی زندگی اور راجپوتوں کی عظمتِ رفتہ میں اپنے موضوعات تلاش کیے، علی عباس حسینی نے دیہات کی کراہتی ہوئی زندگی کو افسانوں کا موضوع بنایا، نیاز فتح پوری رومان کی ٹھنڈی چھانو سے اپنے موضوعات تلاش کر لے آئے۔ اپندر ناتھ اشک نے سیاسی موضوعات پر لکھا۔ عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں کے لیے نوجوان مسلم لڑکیوں کے جذبات واحساسات مستعار لیے، منٹو نے طوائف کی تنگ وتاریک اور آلودہ زندگی سے اپنے افسانوں کے شیش محل سجائے۔ بیدی نے پنجاب کے دیہات اور وہاں کے مجبور کسانوں کی زندگی سے خام مواد حاصل کیا۔ کرشن چندر کشمیر کی رومان پرور وادیوں سے موضوعات لے آئے۔ غرض کہ حیات انسانی کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا رہ گیا ہو جو افسانہ نگاروں کی گرفت میں نہ آسکا ہو۔ اردو افسانہ زندگی کی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ رواں دواں ہے اور زندگی کا ہر چیلنج قبول کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ ایک طرف ہندوستان آزاد ہوا اور دوسری طرف آزادی کی قیمت ہندوستانیوں کو تقسیم کی شکل میں چکانی پڑی۔ تقسیم اپنے دامن میں کشت وخون اور فرقہ وارانہ فساد کا وہ منظر لے کر آئی کہ تاریخ میں چشم انسانی نے ایسے دردناک مناظر کم ہی دیکھے ہوں گے۔ ہمارے افسانہ نگاروں نے ان تمام موضوعات پر اپنی انفرادیت باقی رکھتے ہوئے افسانے تخلیق کیے۔ رفتہ رفتہ تاریخ کا پہیہ گھومنے لگا اور زندگی اپنے معمول پر آگئی لیکن زندگی کو اب نئے قسم کے مسائل اور چنوتیوں کا سامنا ہے۔ یہ چیلنج زندگی کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی داخل ہورہا ہے لیکن ہمارے افسانہ نگاران مسائل اور چنوتیوں کا کامیابی کے ساتھ سامنا کر رہے ہیں۔

یہ مسائل اب کسی خاص جغرافیائی علاقے اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ مخصوص نہیں رہ گئے ہیں بلکہ انھوں نے آفاقی اور عالمی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اس طرح کے اہم مسائل میں ہجرت کے مسائل اور موضوعات ہیں، عورتوں کی آزادی اور خودمختاری کے موضوعات ومسائل

ہیں۔ مساوات، عالمی امن اور انسانی برادری کے موضوعات ہیں۔ نسلی تعصب اور جنسی تعصبات کے مسائل ہیں اور یہ تمام موضوعات آفاقی اور عالمی نوعیت کے ہیں جو دنیا کے ہر خطہ اور ہر علاقہ میں عفریت کی طرح سر اٹھائے کھڑے ہیں اور امن، آزادی، مساوات، یک جہتی اور انسانی قدروں کے لیے خطرہ ہیں۔ موجودہ دور میں مہاجر ادیبوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ان موضوعات پر قلمی جہاد کر رہی ہے اور پوری انسانیت کی فلاح و بہبود اور بہتری کے لیے کوشاں ہے۔ خالد سہیل کا شمار بھی انھی درد مند ادیبوں میں کیا جاتا ہے۔

خالد سہیل ایک بسیار نویس قلم کار ہیں اور انھوں نے خود کو کسی ایک خاص صنف میں محصور نہیں کیا۔ وہ ناول نگار ہیں، افسانے تخلیق کرتے ہیں، ڈائری لکھتے ہیں، عالمی ادبیات کے ترجمے کرتے رہتے ہیں، مصنفین اور ادیبوں کے انٹرویوز لیتے ہیں گویا صحافت کے بھی مردِ میدان ہیں، ان سب کے علاوہ نفسیات تو ان کا خاص موضوع اور میدانِ عمل ہے۔ جہاں تک اردو فکشن کی کائنات کی بات ہے تو خالد سہیل نے افسانوں کے تین مجموعے ترتیب دیے ہیں اور ان کے ناولٹ کی تعداد بھی اتفاق سے تین ہی ہے۔ خالد سہیل نے ان ناولوں اور افسانوں میں انسانی برادری کے دکھ درد کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور دنیا کو درپیش نازک مسائل سے اپنے افسانوں کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ ان میں نسلی تعصب، جنسی تعصب، حقوق انسانی، عورتوں کے حقوق اور مسائل، فرد کی ذہنی اور فکری آزادی، انسانی مساوات اور امن عالم جیسے موضوعات پر ان کا قلم خوب چلتا ہے۔ آئندہ صفحات میں انھی موضوعات اور مسائل کا احاطہ مقصود ہے۔

ناولٹ کے موضوعات

خالد سہیل نے تین ناولٹ تخلیق کیے ہیں 'ٹوٹا ہوا آدمی'، 'مقدس جیل' اور 'دریا کے اس پار'۔ اول الذکر دونوں ناولٹ ایک ساتھ ایک ہی جلد میں شائع ہوئے ہیں۔ انھیں یکجا شائع کرنے کے فیصلے کی توجیہہ پیش کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "اپنی دونوں طویل کہانیوں 'ٹوٹا ہوا آدمی' اور 'مقدس جیل' کو میں نے ایک ہی کتاب میں یکجا کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا کہ یہ

دونوں کہانیاں درپردہ اتنی مختلف نہیں جتنی بظاہر نظر آتی ہیں۔ یہ دراصل ایک ہی جدوجہد کے دو مختلف روپ ہیں۔"[12]

'ٹوٹا ہوا آدمی' میں دیارِ مشرق کے ان نوجوانوں کے مسائل کو موضوع کے حصار میں قید کرنے کی کوشش ملتی ہے جو اپنے آبائی ملکوں سے تنگ آ کر، بہتر زندگی اور روشن مستقبل کی تلاش میں مغرب کے آزاد اور کھلے ماحول میں جا بستے ہیں لیکن مختلف وجوہ کی بنا پر اس ماحول کے اقدار کے مطابق اپنی شخصیت کو ڈھالنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً ان کی فکر اور کردار و عمل میں جذباتی، ذہنی اور اعصابی تناؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے اور وہ محرومی اور ناامیدی کے غار میں پھسلتے چلے جاتے ہیں۔ مخالف تہذیبی ماحول میں ان کی شخصیت شکست و ریخت سے دوچار ہوتی رہتی ہے۔ وہ اپنی کشتیاں تو ساحل پر جلا آئے تھے لیکن نئی دنیا اور نئی زندگی کے نشیب و فراز نے انھیں شیر و شکر نہیں ہونے دیا۔ محرومی کا یہی احساس اور شخصیت کا یہی تضاد اس ناول کا موضوع ہے۔ شارب ردولوی نے لکھا ہے:

> ......'ٹوٹا ہوا آدمی' کا بنیادی کردار شہزاد ان پڑھے لکھے نوجوانوں کا نمائندہ ہے جو کسی نہ کسی طرح مجبوراً یا بخوشی امریکہ یا کنیڈا آ تو جاتے ہیں لیکن اپنے اندر اور باہر کے تضاد سے رفتہ رفتہ اس طرح ٹوٹتے جاتے ہیں کہ ذہنی توازن کھو دیتے ہیں۔[13]

اس ناول کے بارے میں خود خالد سہیل پیش لفظ میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

> ......جب انسان پرانے رشتوں سے مایوس ہونے لگتا ہے تو نئے رشتے اپنا دامن پھیلا دیتے ہیں۔ ٹوٹا ہوا آدمی پرانے رشتوں کے ٹوٹنے اور انسان کے اپنی ذات اور کائنات سے نئے رشتے جوڑنے کی کہانی ہے جس میں بیسویں صدی کے انسان کے ہجرت کے غم اور خوشیاں مستزاد

---

12. ٹوٹا ہوا آدمی، ص: 19

13. ایضاً، ص: 13-14

ہیں۔ یہ انسانی مصائب کی طویل رات کی کہانی ہے جس کی کوکھ سے
امیدوں کے سورج کی کرنیں جنم لیتی ہیں۔[14]

'ٹوٹا ہوا آدمی' میں کہانی کا نقش کچھ یوں اتارا گیا ہے کہ شہزاد ملک ایک تعلیم یافتہ پاکستانی مہاجر ہے جو اپنے چچا کے اصرار پر والدین کے ساتھ کینیڈا میں سکونت پذیر ہے۔ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود کینیڈا میں اسے ملازمت نہیں ملی اور وہ بے روزگار ہی رہا۔ بے روزگاری اور بیکاری ہزار غلط راستوں کے دریچے کھولتی ہے۔ شہزاد بھی غلط راستوں کا راہی بن گیا۔ چوری چکاری، منشیات، آوارہ گردی اور سماج دشمن کاموں کی دلدل میں دھنستا ہی چلا گیا۔ اس کی بے راہ روی سے اس کے والدین اور چچا نالاں رہتے تھے۔ شہزاد کا یہ المیہ تھا کہ وہ پاکستان کے روایتی اور مذہبی ماحول کی کثافت سے نکل تو آیا تھا لیکن کناڈا کی آزاد فضا بھی اسے راس نہ آسکی۔ وہ ہیرا کیچڑ سے نکل تو آیا تھا لیکن تاج کا نگینہ نہ بن سکا۔ اس بنا پر اس کی شخصیت ذہنی تضادات کی آماجگاہ بننے لگی۔ پریشان حالی اور افسردگی نے اس کے ذہن میں مستقل جگہ بنالی۔

پاکستان میں شہزاد جس ماحول میں رہتا تھا وہ مذہب اور روایات کی خول میں لپٹا ہوا تھا۔ توہم پرستی اور جہالت نے زندگی کے تمام شعبوں کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ دولت کی غیر مساویانہ اور غیر عادلانہ تقسیم اور بیماری کے آسیب نے انسانوں کے اشرف المخلوقات ہونے کے شرف پر سوالیہ نشان لگا دیے تھے۔ ایک انسان دوسرے پر ظلم کرتا۔ ملک میں نہ تو مذہب کا قانون لاگو تھا اور نہ ہی حکومت کا، ایک طرح کی لاقانونیت اور انارکی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ تھا۔

اس کلفت زدہ ماحول سے نکل کر جب شہزاد کناڈا پہنچا تو وہاں کے ماحول سے خود کو ہم آہنگ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کا رشتہ ماضی سے منقطع تو ہو گیا لیکن مستقبل کی ڈور سے استوار نہ ہوا۔ یہی تضاد اور یہی احساس محرومی ان کی جان کا روگ بن گیا اور وہ رفتہ رفتہ غلط راہوں کا مسافر بن گیا۔

---

14. ٹوٹا ہوا آدمی، ص: 20

کناڈا میں شہزاد کی زندگی تہذیب کے انھی دو دھاروں کے بیچ پس رہی تھی۔ اس کی شخصیت اور اندرون میں قدیم اور جدید کی ایک جنگ جاری رہتی۔ اس شکست وریخت کے ماحول میں اس کے والدین اور چچا موقع بے موقع اسے نصیحتیں کرتے رہتے، یہ وعظ اور پند شہزاد کے جلے پر نمک کا کام کرتے۔ ایک دن شہزاد کے چچا نے غلط وقت پر ناصحانہ لکچر دینا شروع کر دیا اور اسے لعنت ملامت کرنے لگے۔ شہزاد کو اپنے چچا سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ ان کی شکل سے بھی نفرت کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ حالات کی ابتری کے لیے اس کے چچا ہی ذمہ دار ہیں، کیوں کہ انھوں نے ہی اصرار کر کے شہزاد کے والدین کو پاکستان سے کنیڈا بلایا تھا۔ الغرض اس بے موقع نصیحت سے شہزاد کا خون کھول اٹھا، وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اگر اس کے والدین بیچ میں نہ آجاتے تو شاید اس دن کوئی ان ہونی ہو جاتی۔ شہزاد گھر سے حیران و پریشان نکل گیا، اور اپنی ایک گرل فرینڈ کے ساتھ نیاگرا فال پہنچا۔ وہاں اپنی گرل فرینڈ سے لڑ بیٹھا، گویا مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ اسے اپنی زندگی بے معنی معلوم ہونے لگی اور وہ اپنی ہی ذات کا دشمن بن گیا۔ آخر کار ایک دن غیر متوقع طور پر اس کے ہاتھوں چچا کا خون ہو گیا۔ قانون کی نگاہ میں اب وہ ایک خونی مجرم تھا۔

حالات سے تنگ آکر شہزاد نے کئی مرتبہ اقدامِ خودکشی کیا لیکن سخت جان نکلا اور اسپتال پہنچ گیا۔ وہاں اس کی ملاقات جیولی نام کی ایک لیڈی ڈاکٹر سے ہوئی، جیولی نے شہزاد کے زخموں پر مرہم رکھا اور اس کی بے چین روح کو ہمدردی اور محبت کے نغموں سے سکون پہنچایا۔ اب شہزاد کی زندگی میں رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ پیدا ہونے لگا۔ ورنہ وہ تو اتنا سیماب پا تھا کہ مختلف جرائم کی علت میں سزا یافتہ تھا، کبھی نشہ آور ادویات لینے کی علت میں، کبھی غلط ڈرائیونگ کی علت میں اور کبھی ہوٹل اور ریستورانوں میں مقامی باشندوں کے ساتھ ہاتھا پائی اور فتنہ وفساد برپا کرنے کی علت میں۔

جیولی اس کی زندگی میں ایک سرد جھونکے کی طرح داخل ہوئی اور اس کے سارے وجود کو معطر کر گئی۔ شہزاد، جیولی کی خوب صورتی اور حسن سیرت سے متاثر ہو کر اس سے والہانہ پیار کرنے لگا۔ جیولی بھی شہزاد کی صاف گوئی اور دیانت داری کی دل سے قدر کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ ہمدردی کے جذبات نے محبت کا روپ لے لیا اور جیولی نے شہزاد کو اپنے جسم و جان پر اختیار دے دیا۔

اسپتال میں ڈاکٹروں نے تجویز کیا کہ ذہنی توازن کھودینے کی وجہ سے شہزاد نے اپنے چچا کا قتل کیا تھا۔ چنانچہ اسے ایک انتہائی نگہ داشت والے اسپتال میں داخل کردیا گیا۔ وہاں حالات کی ستم ظریفی سے تنگ آکر شہزاد نے کئی مرتبہ خودکشی کا اقدام کیا لیکن ناکام رہا۔ اسی دوران اسے خبر ملی کہ اس کی دوست جیولی نے ایک بچے کو جنم دیا ہے اور اس معصوم کا باپ وہ خود ہے تو اس کی آنکھوں میں امید اور خوشی کے دیے جھلملانے لگے۔

اب شہزاد کی شخصیت میں ایک انقلاب رونما ہونے لگا۔ باپ بننے کے خوب صورت احساس نے اس کے اندر کے سارے زہر کو ہوا میں تحلیل کردیا۔ اور دھیرے دھیرے وہ ایک شفیق باپ کے جذبے سے سرشار ہونے لگا۔ اس کی شخصیت کا سارا کرب اور زہر، آنسو بن بن کر بہہ گیا۔ وہ اسپتال سے موقع نکال کر جیولی اور بچے کے ساتھ ازدواجی زندگی کی لذتوں سے ہم کنار ہوا۔ شہزاد نے جی بھر کے ارمان نکالے۔ ایک بچے کا باپ بن کر اس کے رویوں میں انقلابی تبدیلی ظاہر ہونے لگی۔ وہ اپنے بچے سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اب اس کی زندگی کرب اور اذیت کے بجائے سکون اور گداز سے عبارت تھی۔

اسی دوران اتفاق سے شہزاد کی ملاقات ابراہیم نام کے ایک شخص سے ہوئی۔ وہ انتہائی متحمل مزاج، نرم خو اور مہربان دوست ثابت ہوا۔ شہزاد جس کی زندگی کا کوئی مقصد نہ تھا، ابراہیم نے اسے ایک بامقصد راہ پر لگادیا۔ گویا وہ خضرِ راہ کی حیثیت سے اس کی زندگی میں داخل ہوا۔ شہزاد نے بیٹے کی خاطر نشے کی عادت ترک کردی۔ اب وہ بچے کے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا، اس کی زندگی اب معمول کی پٹری پر لوٹ رہی تھی۔

جیولی جو شہزاد کے بچے کی ماں تھی اور ابھی تک بچے کی پرورش و پرداخت کررہی تھی، ایک ذہنی اور نفسیاتی الجھاؤ میں پھنس گئی۔ وہ شہزاد سے بھی کچھ اکھڑی اکھڑی رہنے لگی، آخر ایک دن دونوں میں سخت کلامی بھی ہوئی۔ اسی دوران ایک اور حادثہ جیولی کے لیے حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ میڈیکل کالج نے جیولی کی پریکٹس کا لائسنس منسوخ کردیا۔ الزام یہ تھا کہ جیولی اپنے مریض کے ساتھ رومانوی اور جسمانی طور سے ملوث ہے جو کالج کے قوانین اور پریکٹس کی اخلاقیات کی

رُو سے جرم تھا۔ جیولی اس فیصلے کی تاب نہ لا سکی اور خود کشی کر موت کو گلے لگالیا۔

اب شہزاد کے سامنے ایڈم کی پرورش کا مسئلہ کھڑا ہوا کیوں کہ اس کے علاوہ اس معصوم کا اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ چنانچہ وہ اپنے بچے کو ساتھ لے کر بغیر کسی کو خبر کیے نیوفن لینڈ چلا گیا جہاں اس کا دوست اور خضر راہ ابراہیم بود و باش کرتا تھا۔ وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے گھومتا رہا۔ ایڈم، شہزاد اور ابراہیم خوشی خوشی رہنے لگے اور تقریباً بارہ برس تک وہ لوگ اطمینان، آرام اور سکون کی زندگی گزارتے رہے لیکن اچانک ان کی کشتی ایک طوفان سے ٹکرا گئی۔ ٹورنٹو کی پولیس شہزاد کی تلاش میں ابراہیم کے گھر تک آ پہنچی۔ ابراہیم کی لاکھ کوششوں کے باوجود پولیس اسے گرفتار کر ٹورنٹو لے آئی۔ پولیس کے ریکارڈ اور اسپتال کی فائلوں میں آخر شہزاد ایک مفرور ملزم تھا۔

شہزاد ملک پر مقدمہ چلا اور جج نے تمام ممکنہ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے فیصلہ سنایا کہ شہزاد کو مزید تین مہینوں کے لیے اسپتال میں سخت نگرانی والے وارڈ میں رکھا جائے جہاں اس کی ذہنی تندرستی کا اندازہ لگایا جائے گا۔ یہ پہلا موقع تھا جب شہزاد نے کوئی جرح نہیں کی، کوئی احتجاج نہیں کیا بلکہ تحمل، صبر اور بردباری کا نمونہ پیش کرتے ہوئے پولیس کے ہمراہ چل دیا اس کے سبھی رفیق اور ہمراہی مستقبل سے بے خبر، پیار بھری نظروں سے یہ منظر دیکھتے رہے۔ کہانی اسی غیر یقینی موڑ پر ختم ہو جاتی ہے۔

اس کہانی کے ذریعہ خالد سہیل نے ایشیائی ممالک کے ان باشندوں اور نوجوانوں کی ذہنی کیفیات کو کاغذ پر منتقل کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنے ملک کی سیاسی اور معاشی صورتِ حال سے ناامید ہو کر روشن مستقبل کی تلاش میں مغرب کا رخ کرتے ہیں۔ یوں تو انھوں نے بنیادی موضوع کی حیثیت سے ترکِ وطن کے نتیجے میں پیش آنے والی کلفتوں کو کہانی کے مرکز میں رکھا ہے لیکن موضوع کی تشریح کے دوران بہت سارے ایسے مسائل سے بھی پردہ اٹھایا ہے، ایشیائی ممالک کے باشندے جن سے نبرد آزما رہتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے بڑا مسئلہ نفسیاتی نوعیت کا ہے۔ جب یہ لوگ اپنے ملک، اپنی زمین، اپنے رسم و رواج اور تہذیب و تمدن کو چھوڑ کر نئے ماحول سے روبرو ہوتے ہیں تو زندگی کے ہر موڑ پر تضادات کے آسیب ان کا پیچھا کرتے

ہیں۔ رہن سہن، رسم و رواج، عقائد و اوہام، نظریات و خیالات، اخلاقیات اور معیار زندگی، معاشرتی اور مذہبی مسائل غرض یہ کہ مختلف سطحوں پر تضادات کا ایک لامتناہی سلسلہ ان کی شخصیت کو پارہ پارہ کرتا رہتا ہے اور وہ اندر سے ٹوٹتے رہتے ہیں۔ اس دوران کچھ ایسے سخت مقامات بھی آتے ہیں جب عقائد و نظریات کی بہت ساری قدیم عمارتیں زمین دوز ہونے لگتی ہیں اور مہاجر اپنے عقائد و اعمال کے تضاد سے ٹوٹ کر ذہنی توازن برقرار نہیں رکھ پاتا۔ وہ نیم دیوانگی کے مرض میں مبتلا ہو کر مختلف قسم کے غیر سماجی کاموں میں ملوث ہونے لگتا ہے اور چوری چکاری، لوٹ مار اور منشیات کے کاموں میں اپنی شخصیت کو گم کر دیتا ہے۔

ذات کے اسی تضاد سے جڑا ہوا ایک اور مسئلہ سامنے آتا ہے۔ شہزادا ایک ذہنی مریض ہے اور اسپتال میں زیرِ علاج ہے۔ اسپتال کی ایک ڈاکٹر جیولی سے اس کا رومانوی رشتہ استوار ہونے کی پاداش میں ڈاکٹر کا پریکٹسنگ لائسنس منسوخ کر دیا گیا۔ کیوں کہ وہاں کے قانون کی روشنی میں ایک ڈاکٹر کا اپنے مریض سے رومانوی طور پر ملوث ہونا طب کی اخلاقیات میں جرم ہے۔ سماج کا تضاد دیکھیے جیولی ایک ڈاکٹر ہے، اور ذہنی مریضوں کی مسیحا ہے۔ قانون اور اس کے عمل درآمد کے طریقے سے وہ اس قدر دل برداشتہ ہوتی ہے کہ خودکشی کے دامن میں پناہ لیتی ہے۔ اس کا یہ اقدام اس مہذب اور روشن خیال معاشرے کی پیشانی پر داغ ہے جو ظاہری طور سے بے حد دل کش اور خوب صورت نظر آتا ہے لیکن اندر سے خود تضاد کا مارا ہوا اور انسانی جذبات اور ہمدردی کی خوبیوں سے عاری ہے۔ حالانکہ خود مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس معاشرے میں انسانوں کو چھیانوے فیصدی حقوق حاصل ہیں۔

مغربی معاشرے میں قانون پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ اور کئی بار ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب قانون کی سخت بندشوں سے اکتا کر ملزم یا مجرم نئی طرح کے اقدامات کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف تو مغربی معاشرہ انسانی حقوق کی حمایت کا دم بھرتا ہے اور دوسری طرف قانون کی زنجیریں اتنی سخت اور بے لوچ ہوتی ہیں کہ بے چاری جیولی کی موت کا بہانہ بن جاتی ہیں۔ انسانی حقوق کی پاس داری، بے لوچ اور سخت ضابطے کی پابندی کا تضاد، نئی

نئی طرح کے مسائل کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔

کینیڈا کا معاشرہ انسانی حقوق کی پاس داری اور نگہ بانی کا دم بھرتا ہے اور اعداد و شمار کی روشنی میں وہاں کے عوام کو تقریباً چھیانوے فیصدی انسانی حقوق حاصل ہیں لیکن مصنف کی نباض اور باریک بین نگاہوں نے اس معاشرے میں بھی ظلم اور استحصال کی کچھ مثالیں قاری کے سامنے پیش کی ہیں۔ دماغی اور ذہنی اسپتال میں جہاں مریضوں کے علاج کی غرض سے ان سے مختلف قسم کے کام لیے جاتے ہیں جو ان کی دماغی اور ذہنی بیماری سے نجات دلانے میں معاون ہو سکتے ہیں لیکن اسپتال کے کارکنان اور ذمہ داران، ان مریضوں کا استحصال کرنے سے باز نہیں آتے۔ ایسے موقعوں پر انسانی ہمدردی اور حقوق کا دم بھرنے والے معاشرے کی قلعی اتر جاتی ہے۔ ایسے ہی ایک موقعے کا اقتباس کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

اسپتال میں ایک سپروائزر زیرِ علاج عورتوں سے مخاطب ہے:

.....محترمات! پچھلے ہفتے ہم صرف چھ سو پیکٹ روزانہ بنا سکے آج سے ہمیں آٹھ سو پیکٹ بنانے ہیں۔ ہمارے خریداروں کی ڈیمانڈ بڑھ گئی ہے۔

ایک اور موقع پر جب اسپتال کے مریضوں نے اپنی یونین بنائی اور اپنے حقوق کا مطالبہ کیا تو اسپتال کے کارکن کا ردِ عمل دیکھیے:

......ہم مریضوں کی مدد کرتے ہیں، استحصال نہیں کرتے، ہم نے آپ سے کبھی ناجائز یا غیر مناسب کام کرنے کو نہیں کہا۔ یہ سب آپ کے بھلے کا کام ہے۔ یہ تھیرپی ہے۔

شہزاد اس جواب سے بہت جز بز ہوا۔ کہنے لگا:

.....اگر یہ تھیرپی ہے تو آپ نے بٹنوں کے زیادہ پیکٹ بنانے کا آرڈر کیوں دیا تھا۔

میں نے ایسا آرڈر نہیں دیا۔

مجھے اور بھی غصہ چڑھ گیا وہ شخص جھوٹ بول رہا تھا۔

یہ مختصر اقتباس مغربی معاشرے کے اس دعوے کی اصلیت کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی ہے جسے انسانی جذبات اور حقوقِ انسانی کی پاس داری کا زعم ہے۔ یہاں خالد سہیل کا مخلص رویہ بھی سامنے آتا ہے کہ وہ انتہائی خلوص کے ساتھ حق گوئی اور حقیقت بیانی کا دامن تھامے رہتے ہیں اور ان کا یہ مخلص اور غیر متعصب رویہ ہر جگہ حاوی رہتا ہے۔

اس معاشرے کا ایک اور تضاد اس وقت سامنے آیا جب شہزاد اپنی پچھلی زندگی سے تائب ہوکر ابراہیم کے ساتھ پرسکون زندگی گزارنے کی جدوجہد میں الجھا ہوا ہے۔ اور اپنے معصوم بچے ایڈم کی پرورش ایک ذمہ دار باپ کی طرح انجام دیتا ہے لیکن دوسری طرف قانون اور اسپتال کے اصول وضوابط کی روشنی میں وہ ایک مفرور ملزم ہے۔ اپنی تمام تر آزاد خیالی اور حقوق انسانی کے تئیں ہمدردی کے جذبات رکھنے کے باوجود معاشرہ یہاں نئی طرح کے تضاد کا شکار ہے۔ انسانی ہمدردی اور بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے باوجود سماج میں نئی نئی قسم کے مسائل ارباب اقتدار کے سامنے چیلنج بنے رہتے ہیں جن کا تدارک خود ان کے پاس بھی نہیں ہے۔ ایک مقام پر خالد سہیل نے اعتراف کیا ہے کہ:

> .....ہم ہر روز بہت سے ایسے لوگوں سے ملتے ہیں جو اندر سے ٹوٹ رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ پورے معاشرے کے لیے ایک چیلنج ہیں ہمارے پاس ان کا کوئی علاج نہیں۔ Psychiatric system کے پاس، نہ Legal system کے پاس، نہ Family system کے پاس اور نہ ہی Social Welfare system کے پاس۔ لیکن بدقسمتی سے ابھی ہم اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، اس لیے ہر نظام مسائل کو دوسرے نظام کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ جب سارے نظام ناکام ہوجاتے ہیں اس وقت بعض دفعہ زندگی پراسرار طریقوں سے منزل کی نشان دہی کرتی ہے۔[15]

---

15. ٹوٹا ہوا آدمی، ص:20

گویا انسانی ہمدردی اور مساوات کے بلند بانگ دعووں کے باوجود وہاں کے افراد نفسیاتی اور ذہنی مسائل سے دوچار رہتے ہیں اور ایسا عمل وہاں کی زندگی کا ایک تاریک پہلو ہے۔

ناول میں کرداروں کے عمل اور ردِ عمل کی کش مکش سے ایک اور بنیادی مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور یہ مسائل ہر اس ملک کے سامنے آتے ہیں جہاں مہاجروں اور تارکینِ وطن کی اچھی خاصی تعداد سکونت پذیر ہو۔ اس ناول میں بھی رنجیت کا کردار ان مہاجروں کی زندگی کا علامیہ ہے جو غیر قانونی طریقے سے کسی ملک میں زندگی بسر کر رہے ہوں۔ غیر قانونی طور سے کسی ملک میں روپوشی کی زندگی گزارنا ایک بین الاقوامی جرم ہے۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بین الاقوامی جرائم کا ارتکاب کرنے والے کسی بھی قسم کے سماجی اور اخلاقی جرائم میں آسانی سے ملوث ہو سکتے ہیں۔ بالخصوص جن کاموں کا تعلق انڈر ورلڈ اور جرائم کی کالی دنیا سے ہوتا ہے اور بالآخر یہ طبقہ قانون اور ملک کی سالمیت کے لیے مستقل خطرات پیدا کرتا رہتا ہے۔

'مقدس جیل' کے لیے جس پس منظر پر کہانی کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے وہ مشرقِ وسطیٰ میں سعودی عرب کا علاقہ ہے۔ اس طویل کہانی کا موضوع ارضِ مقدس کی زندگی اور اس کے شب و روز کے تضادات سے پیدا صورتِ حال سے لیا گیا ہے۔ سعودی عرب کی زندگی، وہاں کے شب و روز، زندگی اور کائنات کے بارے میں وہاں کے باشندوں کے نظریات، خیالات اور جذبات میں کس قسم کے تضادات اور الجھاو ہیں، عورتوں کے بارے میں ان کے رویے اور سلوک کیا ہیں، عورتوں کے حقوق کے تئیں وہاں کے عوام اور حکومت کی مشینری کس حد تک سنجیدہ ہے۔ ان تمام مسائل کو ایک نرس کی آنکھوں سے دکھلانے اور اسی کی زبان سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ باتیں خالد سہیل کسی ہندوستانی یا مشرقی عورت کی زبان سے بھی کہلوا سکتے تھے لیکن انھوں نے چابک دستی، فن کاری اور احتیاط کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک مغربی کردار کی زبانی، اس صورت حال کی تصویر کشی کی ہے تاکہ درمیان میں مغرب و مشرق کے تضادات بھی پیش نظر رہیں اور ان کا مقابلہ و موازنہ بھی منطقی بنیادوں پر ہو سکے۔

'مقدس جیل' کی کہانی کچھ یوں ترتیب پاتی ہے کہ ورانیکا نام کی ایک کنیڈین لڑکی

سعودی عرب میں نرس کی ملازمت کرنے آتی ہے۔ نئے ماحول اور نئی زمین سے خود کو ہم آہنگ کرنے میں اسے خاصی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، قدم قدم پر تضادات کے آسیب سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ وہ جس عمارت میں رہتی ہے اس میں اور بھی بہت ساری نرسیں قیام پذیر ہیں۔ ایک نرس مارگریٹ انگلینڈ سے اور دوسری نرس حمیرا شکاگو سے آئی ہیں۔ یہ دونوں نرسیں ورانیکا کی سہیلی، ہم راز اور ہم خیال بن جاتی ہیں۔ سعودی عرب میں عورتوں کے تنہا باہر نکلنے پر پابندی ہے لیکن ورانیکا اور اس کی سہیلیاں کسی نہ کسی طرح باہر نکلتی رہتی ہیں اور سعودی زندگی کے پیچ وخم سے اپنے اپنے تجربات میں اضافہ کرتی ہیں۔ ورانیکا جیسی لڑکی کے لیے جو مغرب کے کھلے معاشرے میں پل بڑھ کر جوان ہوئی ہے اسے یہاں کی پابندیاں اور قوانین راس نہیں آتے۔ ایسی حالت میں جب وہ تضادات اور تعصبات سے روبرو ہوتی ہے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے لیکن ایک نئی طرز زندگی اور نئی معاشرت سے اس کے تجربات کے کچھ تاریک گوشے روشن بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ورانیکا، ایک خوش سلیقہ اور ہمدرد نرس ہے جسے اپنے مریضوں سے ہمدردی اور محبت ہے۔ ایک مریض جب اپنی بیماری سے شفایاب ہو کر واپس اپنے آبائی گاؤں جانے لگتا ہے تو نئے نئے تجربات کی متلاشی ورانیکا بھی اس مریض کے ہمراہ اس کے گاؤں جاتی ہے۔ اور ان لوگوں کی مہمان نوازی، معصومیت اور انسان دوستی سے حد درجہ متاثر ہوتی ہے۔ فطری معصومیت، گاؤں کے امتیازات میں شامل ہے، دیہات کے میزبان، انتہائی خلوص اور اپنائیت سے ورانیکا کی مہمان نوازی کرتے ہیں۔ اس سفر اور ملاقات نے سعودی زندگی کے کچھ خوش گوار پہلوؤں سے ورانیکا کے دل و دماغ کو واقف کرایا۔ گاؤں کے علاوہ شہر میں بھی ورانیکا کو کئی گھروں اور خاندانوں کے ساتھ ملنے جلنے اور ملاقات کا اتفاق ہوا تھا۔ اس تجربے میں اس کی دوست حمیرا اس کی شریک تھی۔ اس طرح ورانیکا، سعودی زندگی کے روشن اور تاریک گوشوں کو اپنے تجربات کا حصہ بنانے میں کامیاب ہو گئی۔ آخر کار مختلف منزلوں اور تجربوں سے گزرتی ہوئی یہ کہانی اس وقت اپنے اختتام کو پہنچتی ہے جب ورانیکا نے سعودی زندگی کے تضادات اور تعصبات سے تنگ آ کر اپنی ملازمت سے استعفٰی دے دیا۔ اس لڑکی نے سعودی عرب میں نو مہینے گزارے

اور اب واپس اپنے شہر ٹورنٹو جا رہی ہے تو اس کے خیالات میں انتشار ہے، حواس پراگندہ ہیں اور وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی ہے کہ کسی اور نرس کو سعودی عرب میں ملازمت کرنے کا وہ مشورہ دے گی یا نہیں؟ کہانی یہیں مکمل ہو جاتی ہے۔

'مقدس جیل' میں سعودی عرب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو کہانی کے مرکز میں رکھا گیا ہے اور وہاں کے اصول وقوانین، ان پر عمل درآمد کے طریقے، انسانی حقوق کی پامالی، عورتوں کے حقوق کی پامالی، عورتوں کے تئیں ان کے متعصب نظریات، مذہبی انداز میں زندگی گزارنے کا شعور اور اس انداز میں تضادات سے بے خبر رہنے کی عادت، انھی سب موضوعات کو تخلیقی پیکر میں ڈھالا گیا ہے۔ کہانی چونکہ رپورتاژ کے فارم میں لکھی گئی ہے اس لیے افسانے یا ناولٹ کے گٹھے ہوئے پلاٹ کی کمی کا احساس ہوتا ہے اور کہانی کا تانا بانا پوری طرح دل پر نقش بنانے میں کامیاب نہیں ہو پاتا لیکن ورانیکا کی آنکھوں سے سعودی طرزِ زندگی، وہاں کے رسم ورواج، اخلاقی اور سماجی معیار کی دورنگی کی جو تصویریں ہم دیکھتے ہیں وہ ہمیں سعودی زندگی کے اس مقدس تصور سے بہت مختلف معلوم ہوتی ہیں، اندھی عقیدت کی وجہ سے جو ہمارے ذہنوں پر نقش ہو چکے ہیں۔

'مقدس جیل' سعودی زندگی کے نشیب وفراز کی کہانی ہے۔ اس کہانی میں وہاں کی زندگی کے بہت سارے مسائل پر ناقدانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، اور ہر اس مسئلے کو احتجاج کے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو عورتوں اور انسانی حقوق سے متعلق ہوں اور فرد کی آزادی کو چیلنج کرتے ہوں۔ مغربی معاشرے کی پروردہ اور آزاد خیال لڑکی جب مشرق کے ایک روایتی اور مذہبی ماحول سے روبرو ہوئی تو اس کو مختلف مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ ہاسٹل میں رہنے سے لے کر ضروریات کی تکمیل کے لیے شہر اور بازار میں نکلنے تک ہر مقام پر تضادات ہی تضادات۔ قانون کی پابندیاں اور ان پر سختی سے عمل درآمد اس طرح کیا جاتا تھا جیسے وہ قانون انسانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی سہولت کے لیے نہیں بلکہ انھیں تنگ اور پریشان کرنے کے لیے ترتیب دیے گئے ہوں۔ ورانیکا کو وہاں کا قانون صحیح معنوں میں اندھا قانون معلوم ہوا۔ اسے ہر شخص فرعون اور ابوجہل کی طرح خودسر اور ظالم دکھائی دیتا ہے۔ وہ اس کے اسپتال کا ایڈمنسٹریٹر ہو یا

ٹیکسی ڈرائیور؛ سب کی ذہنیتوں پر تعصب اور خودسری کی دبیز چادر لپٹی ہوئی ہے اور یہ تعصب عورتوں کے مسئلے پر کچھ زیادہ ہی شدید ہو جاتا ہے۔ کہانی میں کئی مقامات ایسے ہیں جہاں مردوں کی بالادستی اور ان کی خودسری کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس جذبے کا پہلا احساس وہاں ہوتا ہے جب ورانیکا اور اس کی سہیلی مارگریٹ، اسپتال کے ایڈمنسٹریٹر سے بڑے کمرے میں منتقل ہونے اور ایک ساتھ رہنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے اس کے دفتر جاتی ہیں۔ ایڈمنسٹریٹر نے، جو ایک سعودی تھا، ان سے سیدھے منہ بات نہ کی اور منتقل ہونے کی اجازت دینے میں تامل سے کام لیا۔ یہاں اخلاقیات کا مسئلہ سامنے آیا کہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ حاکمانہ رویہ روا رکھنا عربوں کی سرشت میں داخل ہے، وہ ان کا قومی مزاج ہے اور صدیوں کی اس روایت کی تصدیق کرتا ہے کہ امیہ اور بلال ماضی کے کردار نہیں بلکہ عہد حاضر میں بھی زندہ اور متحرک ہیں۔ زمین کی سختی اور سنگلاخی نے جذبوں کو بھی سرد اور سخت بنا دیا ہے۔

سعودی عرب کی معاشرت، عورتوں کے حقوق اور آزادی کے مسئلے پر تعصب اور جانب داری کا شکار ہے۔ ناول میں ایک کردار نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے:

> یہ شاید سعودی عرب میں ہی ایسا ہے کہ تفریح کا کوئی معقول انتظام نہیں
> .....اگر آپ ایشیا کے دیگر ممالک میں ہوتیں تو حالات کتنے مختلف ہوتے
> ......سعودی عرب میں کچھ پابندیاں زیادہ ہیں وہ بھی عورتوں کے لیے۔

ایک اور جگہ ورانیکا کہتی ہے:

> حقیقت تو یہ تھی کہ سعودی عرب میں عورتوں کو کار چلانے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ حکومت انھیں ڈرائیونگ لائسنس ہی نہیں دیتی۔

مزید ایک مقام پر دو کرداروں کے مکالمے کا ایک حصہ یوں ہے:

> یہاں چار درجے کے شہری ہیں۔
> سعودی مرد اور یورپی اور شمالی امریکہ کے سفید فام پہلے درجہ کے۔
> غیر سعودی عرب دوسرے درجے کے۔

بقیہ ایشیائی مرد جن میں پاکستان، ہندوستان اور فلپینی سب شامل ہیں،
تیسرے درجے کے شہری۔
اور سیاہ فام اور عورتیں چوتھے درجے کے شہری۔

اس اقتباس سے یہ اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ جس طرح ہندوؤں میں ذات پات کی تقسیم ہے اور جنوبی افریقہ میں سیاہ فام اور گوروں کے درمیان تعصب کی خلیجیں حائل ہیں اس طرح سعودی عرب میں مختلف اسباب کی بنا پر تعصب موجود ہے، عورتوں کے بارے میں تو صورتِ حال مزید تشویش ناک ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اسی پاک سرزمین سے ساری دنیا کو مساوات، امن اور رواداری کا پیغام پہنچا تھا۔

عورتوں کی آزادی، حقوق اور سماجی مرتبے کے بارے میں ورانیکا کو ایک نیا تجربہ پیش آیا۔ ایک مرتبہ ورانیکا اور اس کی دونوں سہیلیاں کسی ضرورت سے ایک اسٹور میں جانے لگیں تو دکان دار نے منع کر دیا، اگلے دکان دار نے بھی اندر جانے کی اجازت نہ دی جب وہ لوگ تیسری دکان میں داخل ہونے لگیں تو منیجر نے ایک نوٹس کی طرف اشارہ کیا کہ ''عورتوں کا داخلہ ممنوع ہے۔''

آخر ایک دن اس تعصب اور بدنظری کی انتہا ہوگئی جب ورانیکا تن تنہا شاپنگ کرنے بازار نکلی۔ مردوں کے غلبے والے بازار میں وہ خود کو غیر محفوظ سمجھ رہی تھی اور ہوا بھی کچھ یوں کہ ایک دکان دار نے کپڑوں کی قیمت میں تخفیف کرنے کا وعدہ اس شرط پر کیا کہ ورانیکا اسے بوسہ دے۔ ایک نے اس کے سامنے گرل فرینڈ بن جانے کی تجویز رکھی اور یہی صورت حال اس وقت بھی پیش آئی تھی جب وہ شاپنگ مکمل کر کے اپنی قیام گاہ پر واپس آ رہی تھی۔ شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے، اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے گھر چلنے کو کہا تو اس نے بوسوں کی فرمائش کر ڈالی آخر ایک شریف النفس بس ڈرائیور نے بہ حفاظتِ تمام اسے قیام گاہ تک پہنچایا۔

ناول میں کئی ایسے مقامات اور واقعات پیش آئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ سعودی عرب میں عورتیں مختلف قسم کے تعصبات کا شکار ہیں۔ وہاں عورتوں پر پابندیاں کچھ زیادہ ہیں۔ تنہا

ان کے باہر نکلنے پر پابندی ہے، وہ کار چلانے کی لذت سے محروم ہیں، گورنمنٹ انھیں ڈرائیونگ لائسنس نہیں دیتی۔ سعودی مردوں اور باقی دنیا کے مردوں کے مقابلے میں ان کی سماجی حیثیت کمتر ہے۔ وہ سعودی نظامِ معاشرت میں سیاہ فام لوگوں کے ساتھ چوتھے درجے کی شہری ہیں۔ وہ گاہے بگاہے جنسی تعصب کا بھی شکار ہوتی رہتی ہیں۔ دکان داروں اور ہوٹلوں میں ان کا داخلہ ممنوع ہے اور مردوں کی ہوس پرست نگاہیں انھیں ہمیشہ اپنے نشانے پر رکھتی ہیں۔

سعودی معاشرے میں قانون کا نفاذ سختی سے کیا جاتا ہے۔ ان کے طریقۂ کار کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ واقعی قانون اندھا ہوتا ہے، اس کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔ اس ملک میں برسوں رہنے کے بعد بھی اگر آپ اجازت نامے کے بغیر کہیں دھر لیے گئے تو جیل کی سلاخیں آپ کی منتظر ہوں گی، اور اگر کسی راہ گیر کو انسانیت کے ناطے اپنی کار میں لفٹ دے دی تو آپ پر راہ چلتے مسافروں کو زبردستی اپنی کار میں سوار کرنے کا الزام لگ سکتا ہے۔ وہاں کی پولیس کو بھی دوسرے ایشیائی ممالک کی طرح بے پناہ اختیارات حاصل ہیں اور ذمہ داریاں اور فرائض بے حد کم، وہ احتساب کے دائرے سے باہر رہتے ہیں۔ قانون پر سختی سے عمل درآمد کی مثال حمیرا کے ساتھ پیش آتی ہے جب وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ پولیس کی گرفت میں آجاتی ہے اور سعودی زمین چھوڑنے کے لیے اسے محض بہتر گھنٹوں کی مہلت دی جاتی ہے۔ لیکن تضاد کی بات یہ ہے کہ اسی سعودی سرزمین پر ان علاقوں میں سعودی حکومت کا قانون نہیں چلتا جہاں گورے اور امریکن لوگوں کی بستیاں ہیں۔ ان کے اپنے کلب ہیں جو ان کے قانون کی روشنی میں کھلتے اور بند ہوتے ہیں؛ اور وہاں ہر اس چیز کی آزادی ہے سعودی سرحد میں رہ کر جن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ان بنیادی مسائل کے علاوہ بھی بعض ایسے ضمنی مسائل ہیں جنھیں ناول نگار نے محسوس کرانے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ مثال کے طور پر سعودی کے تعزیری قوانین پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہاں کی حکومت جمہوری نقطۂ نظر کے بجائے آمریت اور شہنشاہی میں یقین رکھتی ہے اور اپنے قول وعمل اور قوانین سے شہنشاہی کی بنیادوں کو استحکام عطا کرتی ہے اور ہر اس اقدام کی حوصلہ شکنی کرتی ہے جس کے راستے ہوکر جمہوریت کی تازہ ہوائیں ملک کی سیاسی اور معاشرتی

زندگی میں داخل ہوسکیں اور ایسا کرنے کے لیے وہ گرفتاریوں اور قانون کے بے جا استعمال سے بھی دریغ نہیں کرتی۔

سعودی معاشرے میں تبادلۂ خیال اور ڈسکشن کی گنجائش نہیں۔ ناول میں ایک مقام پر اس نکتے کو یوں بیان کیا گیا:

> دو ہفتے پہلے ہمارے ایک ہمسائے نے ایک مذہبی محفل کا انتظام کیا۔ دوست احباب جمع تھے، ذکر اور دعا میں مصروف تھے کہ پولیس نے چھاپہ مارا اور ان سب لوگوں کو گرفتار کرلیا۔
>
> 'انھیں گرفتار کیوں کیا' میں ابھی بھی معمہ میں پھنسی ہوئی تھی۔
>
> 'قانون کے مطابق کسی کے گھر میں پانچ سے زیادہ لوگوں کے جمع ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ کیوں کہ پولیس کو یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں حکومت کے خلاف کارروائی نہ ہو رہی ہو۔ لیکن اگر ہم صوفوں پر بیٹھے رہیں اور پولیس آ بھی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب بن بلائے مہمان ہیں۔'
>
> 'مجھے اس خوف و ہراس کی حقیقت اور سنگینی کا آہستہ آہستہ اندازہ ہو رہا تھا۔'

مقاماتِ مقدس میں عصری تعلیم کے مسائل کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے اور سعودی زندگی میں تعدد ازدواج کے رواج کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور معاشرتی طور پر وہاں کی حکومت اور افراد، رنگ و نسل کی بنیاد پر کیا کیا امتیازات اور تعصبات روا رکھتے ہیں اس ناول کی معرفت ہماری نگاہیں ان تاریک گوشوں تک بھی پہنچتی ہیں۔

خالد سہیل کا تیسرا ناولٹ 'دریا کے اس پار' ہے۔ اس ناول میں ایک پختون لڑکی کی جدوجہد آزادی کو بیان کیا گیا ہے۔ اس ناول کا بنیادی کردار سنبل خان ہے جو ایک پختون خاندان کی چشم و چراغ ہے۔ اس کے قبیلے اور خاندان میں دولت کی ریل پیل ہے۔ سنبل زیور

تعلیم سے آراستہ ہے، آزادی اور خودمختاری کا خواب دیکھتی ہے اور کسی بھی قیمت پر اپنی آزادی کا سودا نہیں کرسکتی، وہ ایک غیرت مند لڑکی ہے جو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا ہنر جانتی ہے۔

سنبل نے تعلیم کے بعد نوکری کی۔ ملازمت کرنے کے لیے شروع میں اس کے والد راضی نہیں تھے لیکن رفتہ رفتہ وہ سنبل اور اس کی نانی کی دلیلوں کے آگے جھکتے چلے گئے اور سنبل نے نرس کی ملازمت اختیار کی۔ اسپتال میں فیصل نام کے ایک ڈاکٹر سے راہ و رسم بڑھی اور اس نے محبت کا روپ لے لیا۔ بدقسمتی سے ایک دن سنبل اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ بوس و کنار کرتے ہوئے پکڑی گئی اور نوکری سے برخاست کردی گئی۔ نوکری سے نکالے جانے کے بعد اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ کناڈا چلی آئی۔ کناڈا کی رومان پرور دنیا میں اس کا دوست اسے بھول گیا اور کہیں دوسری جگہ ملوث ہوگیا۔ فیصل دل سے سنبل کی قدر نہیں کرتا تھا، چنانچہ اس کی غیرت جوش میں آئی، اس نے فیصل کا گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور اپنی خاتون دوست لیزا کے گھر منتقل ہوگئی۔

لیزا ایک غیرملکی، اجنبی لیکن مہربان دوست ثابت ہوئی۔ سنبل نے لیزا کے سامنے اپنی زندگی کے ایک ایک ورق کو کھول کر رکھ دیا۔ بچپن کی غریب دوست جنت کے ساتھ رہنے، دریا کے اس پار جانے سے لے کر اپنے گھر اور خاندان کی ایک ایک رسم کو لیزا سے بیان کیا۔ پختون سماج اور تہذیب کے تمام محاسن و معائب پر روشنی ڈالی۔ پختونوں کی قبائلی عصبیت اور مردوں کی بالادستی کی کہانیاں سنائیں۔ اپنی نانی مورے کی استقامت بھری داستانِ حیات بیان کی۔ ان کی آزادی اور انسانی ہمدردی کی کہانی پیش کی۔ غرض یہ کہ پختون زندگی کی جملہ روایات کو بیانیہ انداز میں کہتی چلی گئی۔ ایک ایک آڑے سے پردہ اٹھاتی رہی۔

لیزا کی رفاقت اور ہمراہی نے سنبل کے اندر کی عورت کو وقار اور اعتماد بخشا۔ اب وہ ایک آزاد خیال عورت تھی۔ اپنے پیروں پر کھڑی تھی۔ سنبل نے تخلیق کے سہارے اپنی شناخت قائم کی اور علمی اور ادبی حلقوں میں عزت و احترام سے مدعو کی جانے لگی۔ نئے نئے لوگوں سے اس کا تعارف ہوا، اس میں رنگ، نسل، ذات پات اور جنس کی کوئی تفریق نہیں تھی، یہی نئے متعلقین اس کے خاندان کے افراد بن گئے۔ دس سالوں میں سنبل کی زندگی بہت پیچھے چھوٹ گئی تھی اب اس

نے خود کو established کرلیا تھا۔ سنبل کو اس کے پیروں پر کھڑا ہونے میں اس کی سہیلیوں اور دوستوں نے حوصلہ افزائی کی۔ ساحرہ اور شائستہ، ڈاکٹر آرمسٹرانگ اور کیون اس کے سفر میں محبت کے جزیرے ثابت ہوئے۔

زندگی کے اس سفر میں سنبل کی ملاقات امریکہ اور کناڈا میں مقیم ایشیائی مہاجرین سے بھی ہوئی۔ ان تنظیموں کے کارکنان سے بھی ملاقاتیں ہوئیں جو مغرب میں اردو زبان وادب کی خدمت کا دم بھرتے تھے اور روشن خیالی اور انسانی ہمدردی کے مینار سمجھے جاتے تھے لیکن جب راز کھلا تو سنبل کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ دراصل روشن خیالی اور سیکولر اقدار کی چادریں اوڑھے یہ قلم کار اور ادیب بنیاد پرستی اور رجعت پسندی کی بنیادیں مضبوط کر رہے ہیں۔ لیکن سنبل نے اپنی شناخت کو بحران کا شکار ہونے سے محفوظ رکھا اور ان موضوعات پر نظمیں اور غزلیں تخلیق کرتی رہی، عام طور سے جو موضوعات شجر ممنوعہ کے ذیل میں آتے تھے۔ ان میں جنسی مسائل، عورتوں کے انفرادی اور نفسیاتی مسائل کو خاص طور سے جگہ ملتی تھی۔ عالمی مسائل اور عالمی امن کے بارے میں سنبل کا قلم زیادہ روانی کے ساتھ چلتا اور اس انفرادی تخلیق کا پھل سنبل کو اس شکل میں ملا کہ اس کی کتابیں اور نظمیں نصاب میں شامل کرلی گئیں۔ سنبل کے لیے یہ ایک خوش گوار احساس تھا۔

اسی دوران سنبل کی ملاقات ہیری سے ہوئی۔ ہیری ایک پینٹر تھا عام روش سے ہٹ کر اس نے محنت کش کسانوں اور حاملہ عورتوں کی زندگی کو اپنی پینٹنگ کے خوب صورت رنگوں میں اتارا تھا۔ اس ذہنی قربت کی وجہ سے ہیری کی شخصیت سنبل کے لیے توجہ اور دلچسپی کا مرکز بن گئی۔ دونوں کی جان پہچان وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رفاقت، دوستی اور عشق کی منزل میں داخل ہوئی۔ دونوں ذہنی رفیق بن گئے لیکن سنبل ہیری کو اپنانے میں تردد کا شکار تھی۔ اس دوران فیصل اپنی غلطیوں پر نادم، معافی کا خواستگار ہوا لیکن سنبل کی غیرت اور انا نے اسے قبول نہ کیا۔ ہیری اور سنبل ایک دوسرے کے رفیق بن کر ساری دنیا کی سیر کرتے، ہیری پینٹنگ بناتا اور سنبل اپنے مشاہدات اور تجربات کو نظم کے قالب میں ڈھالتی۔

سنبل کے ایام زندگی ادبی، سماجی اور تہذیبی قدروں کی تلاش میں پرسکون انداز سے

گزر رہے تھے کہ اچانک ایک دن خبر آئی کہ پاکستان میں اس کے والد سکندر خان کو دشمنوں نے مسجد کے اندر گولی کا نشانہ بنادیا ہے۔ سنبل فوراً پاکستان کے لیے روانہ ہوگئی۔ قسمت کا تماشا یہ ہوا کہ اس کے والد اسی اسپتال میں زیر علاج تھے جہاں وہ اپنی بیٹی کو کام کرنے سے روکتے تھے۔ الغرض اسی اسپتال میں ان کا علاج جاری رہا۔ بیٹی اور باپ کا سامنا کچھ جذباتی رہا۔ سکندر خان اپنی بیٹی کے گھر چھوڑ کر چلے جانے کو ابھی تک ہضم نہیں کر سکے تھے، انھوں نے اپنا سارا غصہ اور زہر سنبل پر اگلنا شروع کر دیا۔ سنبل بھی کہاں خاموش رہنے والی تھی، اس کی رگوں میں بھی اپنے جلالی باپ اور آزاد ماں کا خون گردش کر رہا تھا۔ اس نے باپ کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ بیٹی کا جواب سن کر سکندر خان خاموش ہو گئے۔ سنبل کناڈا واپس چلی آئی اور چند دنوں کے بعد اس کے والد آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔

چند دن ہی گزرے تھے کہ سنبل کی نانی مورے سخت بیمار ہوئیں، ان کی عیادت کے لیے اسے واپس پاکستان آنا پڑا۔ مورے نے سنبل سے ایک وعدہ لیا کہ وہ نسلوں کی خاندانی دشمنی کو دوستی سے ضرور بدل دے گی۔ اس سفر میں سنبل کو اسی اسپتال میں تقریر کی دعوت دی گئی جہاں سے اسے بدکرداری کے الزام میں برطرف کر دیا گیا تھا۔ اسکول کی دیواروں پر اپنی کتاب کی تشہیر دیکھ کر سنبل کی خوشی اور حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ وہیں اس کی ملاقات عنبر سے ہوئی جو سکندر خان کے رقیب ازلی جہاں گیر خان کی بیٹی تھی۔ دونوں دشمنوں کی عاقبت اندیش بیٹیوں نے نسلوں کی پرانی دشمنی ختم کر ایک نئے عہد کی بنیاد رکھی اور ایک ایسے مدرسے کا خاکہ تیار کیا جہاں غریب اور کمزور خاندانوں کی لڑکیاں تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوں، اسکول کی عمارت تیار ہوئی اور سب سے پہلا داخلہ غریب جنت کی بیٹی کو ملا۔ مورے یہ انقلابی خبر سن کر ابدی نیند سو گئیں۔ نسلوں کی پرانی دشمنی کا طوفان تھم گیا اور لہریں پر سکون ہو گئیں۔

ہیری، سنبل سے شادی کا خواہش مند تھا لیکن سنبل اس سے شادی کرنے کے بارے میں تذبذب کا شکار تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں چیلنج بھرے کئی دریا عبور کیے تھے لیکن اس دریا کو پار کرنے کی ہمت وہ نہیں کر پا رہی تھی۔ ایک دن ہیری نے سنبل کے سامنے شادی کی تجویز رکھی

جسے سنبل قبول نہ کر سکی۔ ہیری ناامید ہو کر چلا گیا اور سنبل بالکل تنہا رہ گئی۔ اس کے چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی تھی۔ بے چارے ہیری کو کیا پتہ تھا کہ سنبل نے اس سے شادی سے انکار کیوں کیا تھا؟ اس کے والد نے مرتے وقت اپنی وصیت میں تحریر کیا تھا کہ اگر اس کی بیٹی کسی سفید فام سے شادی کرلے گی تو اپنے باپ کی ساری وراثت سے محروم ہو جائے گی اور ساری جائداد اس کے چچازاد بھائی افراسیاب کے نام منتقل ہو جائے گی۔ ایسا ہو جانے کی صورت میں نانی مورے کے خواب اور خود سنبل اور عنبر کے خوابوں کے بکھر جانے کا اندیشہ تھا۔

اس ناول میں عورتوں کی آزادی اور خود مختاری کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا بنیادی مسئلہ انسان کی آزادی اور اس کے انتخاب کی ذمہ داری ہے۔ یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو عزتِ نفس، خود اعتمادی اور آزادی کے لیے ہر اس دیوار سے ٹکر لیتی ہے جو اس کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ عورتوں کی آزادی کے سلسلے میں جو بھی سخت مقام آتے ہیں اس ناول میں اسی کو ایک مسئلے کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ عورتوں کی آزادی کا پورا مسئلہ بہت الجھا ہوا ہے۔ یوں تو مسلم معاشرے میں لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ تا ہنوز متنازعہ بنا ہوا ہے لیکن خاص طور سے پختون سماج میں عورتوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا معیوب تصور کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول کی بنیادی کردار سنبل جب تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو کر ملازمت کی راہ اختیار کرتی ہے تو طوفان آجاتا ہے۔ اس کے والد سکندر خان کی غیرت قومی کو جوش آتا ہے اور وہ اپنی بیٹی کو ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سکندر خان کے اس رویے سے خالد سہیل نے پختون سماج میں تعلیم کی تشویش ناک صورت حال، تعلیم نسواں کے تئیں غفلت شعاری اور ملازمت کے بارے میں متعصبانہ رویوں کی نشان دہی کی ہے۔

مسلم سماج میں عموماً اور پختون سماج میں خصوصاً عورتوں کا سارا کیریر شادی تک آتے آتے دم توڑ دیتا ہے۔ آزادی اور خود مختاری کی تمام قندیلیں یہاں گل ہونے لگتی ہیں۔ خالد سہیل نے اس معاشرتی مسئلے کی جانب بھی توجہ دلائی ہے کہ پختون سماج میں عورتوں کی اصل ذمہ داری گھر اور خاندان کی نگہ داشت اور افزائشِ نسل میں اپنا کردار نبھانے تک محدود ہے۔ عورتیں، گھر،

خاندان اور کاروباری ذمہ داریوں کا کوئی بوجھ نہیں اٹھا سکتیں۔ روایتوں کے حصار میں یہ سماج اس قدر جکڑا ہوا ہے کہ آخری فیصلہ گھر اور خاندان کے سربراہ کا ہوتا ہے۔ تبادلۂ خیال اور آزادانہ رائے دہندگی کے لیے اس معاشرے میں کوئی جگہ نہیں۔

اپنی دوسری تخلیقات کی طرح خالد سہیل نے اس ناول میں بھی انسانی جذبات اور انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر استوار رشتوں کو انسانیت کے لیے زندگی کا حاصل قرار دیا ہے۔ ایک ایسے موڑ پر جب انسان اپنوں سے ناامید ہو جاتا ہے اور تنہائی اور ذات کا کرب ناقابل برداشت ہونے لگتا ہے تو فطرت نئے روپ میں انسان کا دامن تھام لیتی ہے اور اسے ناامیدی، یاس اور محرومی سے نجات دلانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ ایک ایسے ماحول میں جب رنگ، نسل، ذات برادری اور مذہب کے سارے رشتے بے معنی ہو جاتے ہیں تو انسانیت کی فلاح کے لیے اور انسانوں کو ناامیدی کے غاروں سے نجات دلانے کے لیے زندگی ایک نئی روشنی اور اجالے کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ لیزا اور ہیری اسی انسانی ہمدردی کے جذبات کے عکاس ہیں۔

اس کہانی میں خالد سہیل نے پختون سماج اور اس کے طرز حیات کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ رہن سہن، طرز زندگی، کاروبار، زمین جائداد اور ان سب پر مردوں کی اجارہ داری اور بالادستی کو بھی قاری کے سامنے لانے میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ پختون سماج میں ناخواندہ اور ان پڑھ رہنا بہت معیوب بات نہیں ہے اگر کوئی قلم کے بجائے انگوٹھے کا استعمال کرتا ہے تو اس سے اس کی اہمیت پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اس کا قد اس بات سے متعین کیا جاتا ہے کہ اس کے کندھے پر کتنی بندوقیں رہتی ہیں اور اس کے صحن میں کتنی چارپائیاں بچھتی ہیں۔ وہاں علم کی کوئی وقعت نہیں، اس زمین میں علم اور دانائی کے پھول نہیں کھلتے۔ بلکہ جاگیردانہ ذہنیت، سیر و شکار اور تفریح، نسلوں کی دشمن داری ان کے امتیازات تھے۔ عورتوں کے بارے میں یہ سماج انتہا پسند نظریہ رکھتا ہے، انھیں پردوں میں رکھنے کا رواج عام ہے، وہ اولاً تو گھر کی چار دیواری کے باہر قدم نہیں رکھتیں اور اگر بدرجۂ مجبوری اس کی ضرورت آن پڑی تو چادروں میں لپٹ کر باہر نکلتی ہیں۔ پردے کا اہتمام اس سختی سے کیا جاتا ہے کہ عورتیں خود تو چادر میں ملبوس رہتی ہیں،

اس سواری کے گرد بھی پردہ لپیٹا جاتا ہے جس پر انھیں سواری کرنی ہے۔ کھلے آسمان کے نیچے اگر کبھی بھولے بھٹکے کوئی جہاز گزر جاتا تو عورتیں پردے کے مارے دالان سے بھاگ کر خواب گاہوں میں جا گھستیں۔ مردوں کی غیرت کو یہ گوارا نہیں کہ اس کے گھر کی خواتین کا علاج کوئی غیر مرد کرے۔ یہ رسم اس کی غیرت قومی اور انا کو ٹھیس پہنچاتی اور نتیجتاً عورتیں علاج معالجے کی سہولت سے محروم رہتیں۔

مکان کی تعمیر کے دوران مردان خانے اور زنان خانے کا خاص اہتمام کیا جاتا۔ عورتیں زنان خانوں میں رہتیں اور مرد، باہری حصے میں قیام کرتے۔ پردے کی سختی کا یہ عالم تھا کہ برسوں کی دوستی کے بعد بھی کوئی شخص اپنے دوست کے گھر کی خواتین کو پہچان نہیں سکتا تھا۔

خالد سہیل نے سنبل کے قیامِ کالج کے دوران بہت سے ملکی مسائل پر بھی روشنی ڈالی اور اپنی فکر کو واضح کیا۔ پاکستان کی سیاست میں موجود بہت سارے تضادات اور تعصبات سے بھی پردہ اٹھایا۔ علاقائی بے اطمینانی اور مخصوص طبقے کے لوگوں کے استحصال کو بھی خالد سہیل نے نئے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ سرحدی عوام کے حقوق کی پامالی اور ملک کی سرحد میں رہتے ہوئے ان کے ساتھ کیے جانے والے امتیازات، تعصبات اور برتاو کا ذکر چابک دستی کے ساتھ کیا ہے۔

خالد سہیل نے اس ناول میں ایک اور مسئلے کی جانب اشارہ کیا ہے۔ وہ مسئلہ دراصل مہاجرین کی نفسیات اور ہجرت کے کرب سے جڑا ہوا ہے۔ جو خاندان اپنی جڑوں سے کٹ کر مغرب میں بس گئے ہیں اور خود کو ترقی پسند اور سیکولر کہلانا پسند کرتے ہیں، درحقیقت ان کی نفسیات ابھی اتنی بالغ نہیں ہوئی ہے کہ ان کے ظرف میں ساری انسانیت کا درد سما جائے۔ ترقی پسندی اور روشن خیالی کے دعووں کے باوجود وہ رجعت پسندی اور بنیاد پرستی کی ہی تبلیغ و اشاعت کرتے ہیں۔ کناڈا کی آزاد اور کھلی فضاؤں میں زندگی کا اہم حصہ گزار لینے کے باوجود بیشتر لوگ اپنی مشرقی اقدار، بوسیدہ اور فرسودہ روایات کو گلے لگائے پھرتے ہیں، اور برصغیر کی متعصب اور رجعت پرست ذہنیت کی پرورش میں لگے رہتے ہیں۔ ان خاندانوں کو وہاں کے عصری مسائل

اور مقامی مسائل سے دلچسپی، آگہی اور کمٹ منٹ کم ہوتا ہے اور برصغیر کی سیاست میں رونما ہونے والے سیاسی مسائل پر ان کی دھڑکنیں زیادہ شدت سے دھڑکتی ہیں۔ اس کا براہِ راست اثر یہ ہوتا ہے کہ برصغیر کی سیاست میں رونما ہونے والے واقعات وہاں کے لوگوں اور ان کے سلوک کو متاثر کرتے ہیں ان کے تعلقات پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ یہاں کی سیاست کے سائے ان کی خوش گوار زندگی میں نفرت اور تعصب کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔

خالد سہیل نے عورتوں کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے اس اہم نکتے کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے کہ ساری دنیا میں عورتوں کے مسائل جداگانہ اور الگ نوعیت کے ہیں اور ہر جگہ کے مسائل کو ان کے تہذیبی اور جغرافیائی پس منظر میں حل کرنے کی کوشش ہی بارآور ہو سکے گی۔ کیوں کہ مغرب اور ترقی یافتہ ممالک میں عورتوں کے مسائل کی نوعیت برصغیر اور مشرقِ وسطیٰ میں رہنے والی عورتوں کے مسائل سے بہت مختلف ہیں۔ اس نکتے پر سنجیدگی سے غور کیے بغیر ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش غلط نتیجوں تک لے جائے گی اور تہذیبی اور معاشرتی ٹکراؤ میں اضافہ ہوگا۔ مختلف ممالک میں عورتوں کی آزادی اور خودمختاری کا تصور بھی جداگانہ نوعیت کا ہے۔ ایشیا کی عورتیں آج بھی بنیادی تعلیم اور علاج کے حقوق سے محروم ہیں، افریقہ کی عورتوں کے مسائل الگ نوعیت کے حامل ہیں اور ترقی یافتہ ممالک کی عورتیں اپنے ان محبوباؤں کے ساتھ زندگی گزارنے اور بچے پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں مشرقی ممالک میں جن کا خیال بھی احساسِ گناہ کو دوچند کردے گا۔ غرض یہ کہ ہر علاقے اور ہر تہذیب کے جداگانہ مسائل ہیں اور جداگانہ طریقے سے ہی ان کے حل تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

افسانوں کے موضوعات و مسائل

خالد سہیل کا افسانوی ادب تین ناولٹ اور تین افسانوی مجموعوں کی شکل میں موجود ہے۔ ان دونوں ہی اصناف میں تخلیق کیے گئے ادب کی روشنی میں یہ کہنا نامناسب نہیں ہوگا کہ ان میں خالد سہیل نے اپنی فکری روش اور تنقیدی جہت کو عصری اور عالمی مسائل کے ساتھ ہم آہنگ

کیا ہے۔ جن موضوعات کو قلم کی گرفت میں لیا ہے ان میں سے بعض کا تعلق مہاجرین، تارکینِ وطن اور ہجرت کے گونا گوں مسائل سے ہے اس کے علاوہ اقلیت کے مسائل ہوں یا نسلی تعصب کے، عورتوں کی آزادی، خودمختاری کا مسئلہ ہو یا ان کی مظلومی و مجبوری کا، دنیا میں امن وامان قائم کرنے والوں کا مسئلہ ہو یا اس راہ میں کانٹے بچھانے والوں اور ان کی سیاسی مصلحتوں کا۔ حقوقِ انسانی اور فرد کی آزادی کا مسئلہ ہو یا مختلف تعصبات کی بنیاد پر حاشیے پر کھڑے عوام کا، ان تمام مسائل پر خالد سہیل نے اپنے خاص، سیکولر اور غیر متعصبانہ انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ افسانوں کے مطالعے سے یہ بات صاف ہوتی ہے کہ ان کی روح مظلوم کی حالتِ زار دیکھ کر تڑپ اٹھتی ہے، وہ بلاشبہ مظلوموں کے حامی اور ظالموں اور غاصبوں کی چیرہ دستیوں کے خلاف محاذ آرا ہیں۔

گویا خالد سہیل کی تخلیقات میں تنوع اور رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ اپنے گرد و پیش کی زندگی کو انھوں نے باریکی سے دیکھا ہے اور ان پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اپنے ایک انٹرویو میں ان کا کہنا ہے کہ:

> ......اگر آپ میری کتابوں کو دیکھیں تو آپ کو ایک جنگ کے موضوع پر، ایک سیاہ فام لوگوں کی جدوجہد کے موضوع پر، ایک گے اور لیسبین کے حقوق کے موضوع پر اور ایک عورتوں کے مسائل کے موضوع پر ملے گی۔ یہ سب کتابیں اقلیتوں کے بارے میں ہیں تاکہ اردو کے قاری کو عالمی مسائل اور ان کے بارے میں تحریکوں کا علم ہو سکے۔[16]

اگر خالد سہیل کے تینوں ناولٹ کے موضوعات کا احاطہ کیا جائے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان تینوں ناولٹ میں ہجرت کرنے والوں کے مختلف مسائل کو کہانی اور کرداروں کی مختلف شکلوں میں پیش کیا گیا ہے۔ مقدس جیل کی ورانیکا، ٹوٹا ہوا آدمی کا شہزاد اور دریا کے اس پار کی سنبل، اپنے اپنے ناولٹ کے مرکزی کردار ہیں اور تینوں ہی مہاجروں کی اقلیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ورانیکا، اختیاری ہجرت کر کے ارضِ مقدس میں گئی ہے۔ شہزاد اور سنبل بہتر مستقبل کی تلاش

16. انٹرویو؛ سید عظیم (غیر مطبوعہ)

میں، اپنے وطن اور ماحول کے حبس اور گھٹن سے اکتا کر ترک وطن کا اجباری فیصلہ کرتے ہیں۔ اجباری اور اختیاری ہجرتوں کا فرق دونوں مقامات پر نمایاں ہے لیکن اس سے قطع نظر تینوں کتابوں میں مہاجرین کے مسائل کو کہانی کے مرکز میں رکھا گیا ہے اور اس کے علاوہ بہت سارے ضمنی مسائل کو بھی، جو در حقیقت ہجرت اور اس سے پیدا شدہ صورت حال کی دین ہیں، ان پر بھی ناقدانہ اور ہمدردانہ اظہار خیال کیا ہے۔ یہی صورت حال ان کے افسانوں میں زیادہ وسعت، جامعیت اور گہرائی کے ساتھ ابھرتی ہے۔ چونکہ ناولٹ کے بمقابل افسانوں میں موضوعات کے تنوع اور رنگا رنگی کو زیادہ بہتر طور سے دکھایا جاسکتا ہے اس لیے یہ بات واضح طور سے کہی جاسکتی ہے کہ ناول کے مقابل افسانوں میں موضوعات کی کثرت اور تنوع کے نقش زیادہ گہرائی اور پائیداری کے حامل ہیں۔ خالد سہیل کے افسانوں میں اگر موضوعات کا احاطہ کیا جائے تو مندرجہ ذیل موضوعات اور اس سے مربوط مسائل کو انھوں نے خلاقانہ طور سے برتا ہے۔

ہجرت اور مہاجرین کے مسائل

ہجرت کوئی سیدھا سادا عمل نہیں بلکہ ایک پیچیدہ تجربے کا حامل ہوتا ہے۔ ایک شخص جب ایک مقام سے دوسری جگہ ہجرت کرتا ہے تو سب سے پہلے دو ثقافتوں اور تہذیبوں کے درمیان تضاد اور تصادم کی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے۔ پہلی اس کی اپنی ثقافت ہوتی ہے جو پسند اور ناپسند سے قطع نظر، لاشعوری طور سے اس کے احساسات، جذبات اور تحت الشعور میں جاگزیں رہتی ہے اور دوسری وہ نئی ثقافت جس سے اسے نیا نیا واسطہ پڑا ہے۔ دو ثقافتوں اور دو تہذیبی رویوں کا یہی تضاد اس کی شخصیت اور کردار میں مختلف رنگوں اور شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

ہجرت کے بھی کئی پہلو ہیں اور اس کی ایک سے زیادہ شکلیں ہیں۔ بعض لوگ اختیاری ہجرت کو ترجیح دیتے ہیں، اپنی مرضی سے اپنا وطن چھوڑ کر ایک نئے ملک اور اجنبی ماحول میں اپنا آشیانہ بناتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ نامساعد حالات سے بھی مفاہمت کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور ایک نئے اور بہتر مستقبل کی جانب پیش قدمی کرتے رہتے ہیں۔ نامعقول حالات کے

باوجود وہ اپنا سفر جاری رکھتے ہیں اور راستے میں آنے والی رکاوٹوں سے نبرد آزما ہو کر ان پر فتح پاتے ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہوتا ہے جو اجباری ہجرت کا راستہ اختیار کرتا ہے یعنی اپنی مرضی کے خلاف وہ ترک وطن پر مجبور ہوتے ہیں۔ ملک کے سیاسی، معاشی اور اقتصادی حالات کی بدتری سے تنگ آ کر نقل مکانی کر لیتے ہیں۔ یہ طبقہ اگر نئے حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے میں ناکام ہوتا ہے تو مختلف قسم کے ذہنی اور نفسیاتی تضادات اور مسائل سے دوچار ہونے لگتا ہے۔ مہاجروں کی نفسیاتی اور ذہنی الجھنوں کی ساری کہانی انھیں دو ہجرتوں کے درمیان معلق رہتی ہے۔

خالد سہیل کے افسانوں میں کوئی موضوع اگر بہت شدت سے ابھارا گیا ہے تو وہ ہجرت اور ترک وطن کے نتیجے میں رونما ہونے والے مسائل ہیں۔ ہجرت اپنے دامن میں بے شمار نئے مسائل لے کر وجود پذیر ہوتی ہے۔ اس کی مختلف شکلیں اور مدارج ہوتے ہیں جہاں ایک گروہ اجباری ہجرت کرتا ہے وہیں دوسرا گروہ اختیاری ہجرت سے اپنے مستقبل کو تب وتاب اور توانائی عطا کرتا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں مہاجرین کی شخصیت اور ان کا اندرون، نئی قسم کی تبدیلیوں اور نئے قسم کے تضادات سے ٹکراتے ہیں۔ تہذیبی، معاشرتی، اقتصادی اور مذہبی نقطۂ نظر سے مہاجر ایک نئی صورت حال سے نبرد آزما ہوتا ہے، ذات کا یہی تصادم اور ٹکراؤ بسا اوقات اس کی شخصیت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر مہاجر نئے ماحول اور نئی آب وہوا سے خود کو ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہوتا ہے تو وہی شخصیت دو مختلف تہذیبوں اور دو فکری رویوں کی بہترین ترجمان بن جاتی ہے اور اس حسین امتزاج سے اس کی ترقی کے امکانات میں اضافہ ہوتا ہے۔ مہاجرین کی مختلف ذہنی کیفیتوں اور نفسیاتی الجھاو کو خالد سہیل نے 'جڑیں، شاخیں، پھل' میں بہتر طریقے سے پیش کیا ہے۔ اس کہانی میں برصغیر کے ان مہاجرین کی داستانِ ہجرت اور اس سے پیدا شدہ صورت حال پر روشنی ڈالی گئی ہے جو مغربی ملک کناڈا میں سکونت پذیر ہوئے ہیں۔

خالد سہیل نے جب ہجرت کے مسائل پر قلم اٹھایا تو اس کے بہت سارے پہلوؤں کو نظر میں رکھا۔ کسی بھی مہاجر کے سامنے پہلا بنیادی مسئلہ ذہنی اور نفسیاتی سطح پر پیدا ہوتا ہے۔ جس معاشرے کو مہاجر چھوڑ کر جاتا ہے، لاشعوری طور سے اس معاشرے کے تضادات، اس کی

ترجیحات اور تعصبات مہاجر کے ساتھ ساتھ نئی سرزمین پر پہنچتے ہیں اور نئی زمین اور اس کی قدروں سے تصادم کی شکل میں رونما ہو کر مہاجر کے سامنے ایک نئی صورت حال پیدا کرتے ہیں۔ مہاجر کی شخصیت، ایک جانب نئی قدروں سے حد درجہ متاثر اور مرعوب ہوتی ہے اور دوسری جانب صدیوں کی اس کی اپنی روایات اور عقائد ہوتے ہیں جو اس کی ذہنی تربیت اور شعور کا لازمی حصہ ہوتے ہیں۔ ایسے حالات میں تہذیبی قدروں کا تصادم ہونا لازمی ہے، خالد سہیل نے تہذیبی قدروں کے اسی تصادم کو 'ایک پاؤں میں زنجیر' میں ابھارا ہے۔ داخلی تصادم کبھی نفسیاتی الجھن کی صورت میں اور کبھی بغاوت کی شکل میں خود کو ظاہر کرتا ہے۔ 'دو باپ' میں مشرق و مغرب کے تہذیبی تصادم کو اور 'نوح کے رشتہ دار' میں باپ بیٹے کے بنتے بگڑتے رشتوں اور مغربی دنیا میں دونوں کی ترجیحات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ خالد سہیل نے بطور خاص یہ نکتہ ذہن میں رکھا ہے کہ عام طور سے باپ، اپنی قدیم تہذیب اور وضع کو زیادہ عزیز رکھتا ہے اور اولادیں نئی زندگی کی روشنی میں اپنی قوت پرواز کو نئے آسمانوں سے ہم کنار کرنا چاہتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باپ بیٹوں، بزرگوں اور بچوں، والدین اور اولاد میں تصادم کی صورت پیدا ہونے لگتی ہے جو بسا اوقات نفسیاتی الجھنوں اور بغاوت پر ختم ہوتی ہے۔

مہاجرین کا ایک اور اہم مسئلہ مقامی آبادی سے ان کے تعلقات کی نوعیت کو لے کر ظاہر ہوتا ہے۔ جب کسی ملک میں ممالک غیر سے نقل مکانی ہوتی ہے تو اس ملک میں تہذیبی، معاشرتی اور اقتصادی طریقوں میں بعض تبدیلیوں کا واقع ہونا لازمی رہتا ہے۔ موجودہ زمانے میں دنیا کے بیشتر ممالک اس مسئلے سے دوچار ہیں کیوں کہ سیاسی اور اقتصادی پالیسیوں کی وجہ سے ساری دنیا گھر آنگن میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس لیے نقل مکانی اور پیشے کا اختیار سہل اور آسان ہو گیا ہے، ہجرت کرنا اب بہت اہم اور پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے لیکن جب ہجرت ہوتی ہے اور نسل انسانی، دوسرے مقام پر اپنے آشیانے بناتی ہے تو لامحالہ طور سے مقامی آبادی سے اختلاط کی صورت میں کچھ نئے مسائل سر اٹھاتے ہیں۔ کبھی کبھی مقامی آبادی، ان نئے پرندوں کو خوش آمدید کہتی ہے اور ہر طرح سے ان کے ساتھ اخوت اور برادرانہ رشتے قائم کرنا چاہتی ہے۔ بھائی چارے اور اتفاق و

اتحاد کی ڈور کو مضبوطی سے تھام کر ملک اور قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتی ہے اور بعض اوقات یہ تعلقات، تصادم اور ٹکراو کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ مقامی آبادی کے دلوں میں یہ بات سرایت کر جاتی ہے کہ یہ نئے مہمان، ہماری زمین اور ہمارے قدرتی وسائل کو غصب کرنے اور ہماری بے روزگاری میں اضافے کا باعث بن سکتے ہیں۔ یہ سوچ اور فکر، نئی نفرتوں کو جنم دیتی ہے اور معاملہ، مذہبی اور تہذیبی تصادم سے پرے جسمانی تصادم اور کش مکش تک پہنچتا ہے۔ 'پاگی' میں مہاجرین اور مقامی آبادی کے اسی تصادم اور ٹکراو کو کہانی کے مرکز میں رکھا گیا ہے۔

جب دو تہذیبوں کا سامنا ہوتا ہے تو لازمی طور سے ان کی ابتدائی ملاقات اجنبیت اور غیریت کی دیوار تلے ہوتی ہے اور جب تک اجنبیت کی ان دیواروں کو باہمی تعاون، میل جول، اتفاق واتحاد اور مفاہمت کے بہتر رشتے منہدم نہیں کر دیتے، غلط فہمیاں نئے نئے زاویوں سے سر اٹھاتی رہتی ہیں۔ ایک مخصوص تہذیب سے تعلق رکھنے والے افراد کے بعض اعمال، دوسری تہذیب کے لوگوں کے لیے بیماری، دماغی خلفشار، پاگل پن اور ابنارمل کیفیات پر مبنی معلوم ہوتے ہیں جب کہ صحیح صورت حال اس کے برعکس ہوتی ہے؛ غیریت اور اجنبیت کے رشتوں اور تہذیبی رویوں کو اگر سائنسی طور طریق سے حل نہ کیا گیا تو غلط فہمی اور دشمنی کے اسباب کا پیدا ہو جانا بعید نہیں۔ تہذیبی کشاکش اور تصادم کی اس نئی شکل کو خالد سہیل نے 'برابر لیکن مختلف' میں پیش کیا ہے جس کا بنیادی کردار سمندر خان، اپنے مذہبی اور تہذیبی اعمال کو سرانجام دیتا ہے اور مقامی تہذیب کے لوگوں نے اس کے تمام کاموں کو ایک نئی قسم کی بیماری کا نام دے لیا اور اس غلط فہمی کے پھیر میں سمندر خان کو مختلف قسم کی پریشانیوں اور دقتوں سے دوچار ہونا پڑا۔

ہجرت کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ مہاجر، اپنا وطن اور گھربار تج کر نئے ملک میں آبستا ہے لیکن خود کو نئے ماحول اور زندگی کی نئی قدروں سے ہم آہنگ کر پانے میں ناکام ہوتا ہے۔ جذباتی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ یہ طبقہ اپنی جڑوں سے کٹ تو جاتا ہے لیکن نئی زمین اور نئی آب وہوا میں بہتر ڈھنگ سے نگہ داشت اور پرورش نہ ہونے کی وجہ سے زندگی کی دوڑ میں پیچھے چھوٹ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں داخلی تضادات، اس کی شخصیت کو

شکست و ریخت سے دوچار کرنے لگتے ہیں۔ معاشی اور اقتصادی مسائل کے آگے مجبور اور بے بس ہو کر شکست تسلیم کر لینے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا۔ 'کٹی ہوئی پتنگیں' اسی جذبے پر مبنی کہانی ہے جہاں ہجرت، ایک امید افزا پیغامِ زندگی کے بجائے داخلی اور خارجی کرب کا علامیہ بن جاتی ہے۔

مہاجرین کے بہت سارے ذہنی اور نفسیاتی مسائل کے علاوہ ایک اور اہم مسئلہ جس کی طرف خالد سہیل نے توجہ دی ہے، یہ ہے کہ مہاجرین کی ایک بڑی تعداد غیر ملکوں میں اس طرح بستی ہے کہ انھیں اپنے نئے ملک کے مسائل اور حالات سے باخبری نہیں ہوتی اور وہ ان میں اپنے لیے دلچسپی کا کوئی سامان بھی نہیں پاتے۔ وہ مسائل کی سطح پر نئے ملک کے ماحول اور گرد و پیش میں ڈھل نہیں پاتے۔ برخلاف اس کے، وطن عزیز (اکثر صورتوں میں ہندوستان اور پاکستان) میں رونما ہونے والے معمولی واقعات، حادثات اور سیاسی ہلچل ان کی نبضوں کو تیز اور دل کی دھڑکنوں میں اضافہ کر دیتی ہے۔ یہ لوگ ظاہری طور سے مغربیت اور ترقی پسندی کا چولا پہن کر در پردہ رجعت پسندی، بنیاد پرستی اور علاقائی اور مسلکی تعصبات کی پرورش کرتے رہتے ہیں۔ 'روایتوں کے شہر میں' خالد سہیل نے اسی بنیادی مسئلے کی جانب اشارہ کیا ہے۔

خواتین کے مسائل

خالد سہیل کی تخلیقی کائنات میں دوسرا اہم موضوع 'عورت' ہے۔ یہ کچھ اتفاق تھا کہ خالد سہیل کو زندگی کے مختلف دور میں، الگ الگ موڑ پر عورتوں سے سابقہ پڑتا رہا۔ انھوں نے کہیں اعتراف کیا ہے کہ میں نے عورتوں کو ہر رنگ میں اور ہر پہلو سے دیکھا ہے۔ پاکستان کا یہ پہلا ڈاکٹر تھا جس نے اپنی انٹرنشپ ایک لیڈی ریڈنگ اسپتال میں مکمل کی۔ اس عمل سے یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ انھوں نے عورتوں کے تقریباً بیش تر پہلوؤں کو اپنے افسانوں کا موضوع کیوں کر بنایا؟ لیڈی ریڈنگ اسپتال میں ہر قسم کی بیمار عورتیں، تیمار دار عورتیں اور بچے ان کے گرد و پیش میں رہے۔ قیامِ ایران کے دوران وہ بچوں کے اسپتال میں سرگرمِ عمل رہے، وہاں

بھی بچوں کی نگہ داشت کی خاطر عورتیں ہی ان کے ساتھ ہوتیں۔ غرض یہ کہ پاکستان سے کناڈا تک خالد سہیل نے عورتوں کو بے حد نزدیک سے دیکھا، ان کے مسائل اور مجبوریوں کو سمجھا اور پھر انھیں تخلیق کے عمل سے گزار کر افسانوں میں پیش کر دیا۔ یہ وہ حالات ہیں جس کے تحت ہمیں ان کے افسانوں میں عورت کا کرب، اس کی مظلومیت، اس کا جذبۂ ایثار و قربانی، آزادی اور خودمختاری کی خاطر اس کی جدوجہد اور بے چینی پوری شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ مذہبی، نسلی اور اقتصادی طور سے تعصب کا شکار اس کا وجود انتشار اور شکست کے دوراہے پر کھڑا اپنے خوابوں کو منتشر ہوتا دیکھتا ہے۔ ایسی ہی بے بس اور مفلوک الحال زندگی گزارنے والی عورتوں کے مسائل پر ہمدردی کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ خالد سہیل نے صرف عورت کی مظلومی اور اس کی حالتِ زار کا نوحہ ہی نہیں کیا ہے، ایک طرف انھوں نے اگر اس کی مفلوک الحالی اور مظلومیت کی داستان بیان کی تو دوسری جانب آزاد عورتوں اور باغی خواتین کی انتہا پسندی اور سماج کے تئیں ان کے مثبت اور منفی رویوں پر بھی قلم اٹھایا۔ یہ بات گزر چکی ہے کہ خالد سہیل عورتوں، اقلیتوں اور سیاہ فاموں کے حقوق کے حامی ہیں اور وہ انھیں ہر قسم کی صعوبتوں اور بندشوں سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں وہ عورت ہمدردی کی مستحق ہے جس نے اپنے حقوق کے حصول کی خاطر سماج اور اس کے فرسودہ ضابطوں سے ٹکر لی ہو، مردوں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہو کر شکست تسلیم کر لینے والی عورت ان کی آئیڈیل نہیں۔ اپنے افسانے 'کرچیاں' میں انھوں نے دنیا کے مختلف ممالک کی عورتوں کے بارے میں عوام کے نقطۂ نظر کو مختصر لفظوں میں پیش کیا ہے۔ اس میں ہندوستان کا ذکر ہے جہاں بچیوں کی ولادت باعثِ سعادت و خوش نصیبی نہیں وجہِ ناخوشی و ماتم ہے، اور پاکستان کا ذکر ہے جہاں بچوں اور بچیوں کو بچپن ہی میں امتیازی سلوک کا عادی بناتے ہوئے ان کی پرورش کی جاتی ہے۔ عورتوں کے ساتھ احترام اور عزت کا برتاؤ کرنے کے بجائے ان کے ساتھ ترحم اور ہمدردی کے جذبات روا رکھنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مردوں کی بالادستی والے سماج میں عورتیں، کس کس قسم کی ذلتوں اور عدم تحفظ کے احساس سے گزرتی ہیں، اس درد کو بھی علامتوں کی مدد سے ظاہر کیا گیا

ہے۔ مغربی ممالک میں عورتیں جن مسائل سے دوچار ہیں مثلاً رومانوی زندگی کی ناکامیاں، لمحہ لمحہ بدلتے اور ٹوٹتے رشتے، ذہنی اختلاج اور عدم تحفظ کے احساس سے گھری ہوئی اس کی شخصیت؛ اس مسئلے کو بھی خالد سہیل نے اپنے مخصوص انداز میں اٹھایا ہے اور اخیر میں اپنے فکری رویوں کو بھی افسانوں میں واضح کیا ہے کہ عورتوں کی آزادی اور خودمختاری کے لیے انھیں مساوی حقوق کے علاوہ سماجی اور معاشرتی زندگی میں اقتصادی طور سے بھی خوش حال اور آزاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ زندگی ایک ایسی شاہراہ ہے جہاں مرد و عورت دونوں یکساں طور سے اہمیت کے حامل ہیں۔

'کرچیاں' کے علاوہ عورتوں کے موضوع پر خالد سہیل نے جو افسانے تخلیق کیے ان میں مغربی طرزِ حیات میں خواتین کی سماجی حیثیت کو بہت قدآور اور مضبوط دکھایا ہے۔ 'دو کشتیوں میں سوار' کی فوزیہ معاشی اور جنسی طور سے بے حد مضبوط اور توانا کردار ہے۔ خالد سہیل نے ایک جگہ لکھا ہے:

> .....اگر چہ اس میں کافی کاٹ ہے، میری نگاہ میں اس افسانے کے کردار کا جنسی اظہار......درحقیقت اس کی شخصیت کا بھرپور اظہار ہے۔ میں اس سے پہلے عورت کو افسانوں میں مظلوم پیش کرتا آیا ہوں۔ میرا افسانہ ''کرچیاں'' اس کی مثال ہے۔ یہ پہلا افسانہ ہے جس میں، میں نے عورت کو توانا، آزاد اور خودمختار پیش کیا ہے، اس لیے اس افسانے کا مقصد قارئین کے جنسی جذبات کو بھڑکانا ہرگز نہیں بلکہ عورتوں کے Liberation Process کے Highlight کو کرنا ہے۔[17]

اس کہانی کا مرکزی کردار ایک مہاجر لڑکی فوزیہ ہے جو مغرب کی آزاد اور کھلی فضا میں زندگی گزارتی ہے۔ وہ اپنی شخصیت اور وجود کے آزادانہ اظہار کی کوشاں ہے، انفرادی زندگی کی خواہشوں کو اپنے سینے میں لیے آگے بڑھتی ہے، روایتی مشرقی زندگی کے بندھے ٹکے اصولوں اور اخلاقیات کی پابندی سے بے پرواہ ہے، وہ ایک آزاد پنچھی ہے جو ہر شاخ پر چہکنا چاہتا ہے۔ ذہنی اور اعصابی

17. دو کشتیوں میں سوار؛ ص: 191

طور سے وہ مضبوط ارادے کی مالک ہے۔ اس کی زبردست قوت ارادی اور مغرب کا کھلا معاشرہ اسے آزادانہ زندگی گزارنے کے انتخاب کا حق دیتا ہے۔ اس افسانے میں مغربی ماحول میں مشرقی عورتوں کے آزادانہ رویے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ 'شہوت بھری آنکھیں' اس سے آگے کی منزل ہے جس میں خالد سہیل نے ایک مشرقی عورت کی ذہنی اذیت اور روحانی کرب کو موضوع بنایا ہے کہ اسے اپنے ہی لوگوں کے درمیان خود کو ثابت کرنے کے لیے کن کن اذیتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کے نظریات اور خیالات کی بنیاد پر سماج کے نظریہ سازوں نے اسے اخلاق باختہ اور فاحشہ تک کہا لیکن اعصابی طور سے یہ مضبوط لڑکی اپنے وجود کے اظہار اور اپنے نظریات کی صداقت کے لیے جدوجہد کرتی رہی۔ اسے مشرق کا روایتی اور حبس زدہ ماحول تو راس نہیں آیا لیکن مغربی لوگوں نے اس کو خوش آمدید کہا اور اس کی شخصیت کے فن کارانہ اظہار کے لیے مناسب ماحول دیا۔ رفتہ رفتہ اس کی شخصیت کو ایک نام اور اس کے وجود کو شناخت ملی۔ اس کہانی میں خالد سہیل نے عورتوں کے جنسی جذبات اور اس کے فطری بہاو کو ہر قسم کی قدغن سے آزاد دکھانے کی کوشش کی ہے۔ عورت کی پوری زندگی آئینے کی طرح صاف شفاف ہے، نکھری اور دھلی ہوئی، منافقانہ رویوں اور دہرے پن کے جملہ معائب سے پاک؛ اس میں ایک ایسی عورت کا کردار ابھرتا ہے جو خودداری، انانیت اور خوداعتمادی کی کشتی پر سوار ہو کر اپنی شخصیت اور وجود کو ثابت کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ عورت کی آزادی پر لکھا گیا یہ افسانہ دراصل بنیاد پرستی کی اس نقاب کو بھی اتارتا ہے جو مشرقی لوگوں نے مغربی ماحول میں رہتے ہوئے اپنے اپنے چہروں پر چڑھا رکھی ہے، ایک مکالمہ دیکھیے:

> اسے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ مغرب میں بسنے والے مسلمان مشرق میں رہنے والوں سے بھی زیادہ روایت پرست تھے۔

'ترپ کا اکا' بھی مشرق کی ایک مہاجر لڑکی کے مغرب میں بسنے کی داستان بیان کرتا ہے۔ یہ عورت بھی آزادی اور خودمختاری کے خواب دیکھتی ہے۔ ایک بوسیدہ اور فرسودہ سماج سے بغاوت کر کے مغرب میں جا بستی ہے، اس کے ساتھ اس کا شوہر بھی ہے لیکن جلد ہی اس سے

علاحدگی ہو جاتی ہے کیوں کہ اس کا شوہر دل سے عورتوں کی قدر نہیں کرتا، وہ مردانہ تعصب کے خول میں بند ہے۔ لڑکی بالآخر آزادانہ طور سے اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کرتی ہے۔ اس کردار میں باغیانہ جذبہ اپنی انتہا پر ہے، یہ عورت سماج اور معاشرے، اخلاقی اصول و ضوابط غرض یہ کہ ہر اس چیز سے متنفر اور باغی ہو جاتی ہے جو اس کی آزادی اور جذبۂ خودداری کو چیلنج کرتے ہوں۔ اس بنیادی مسئلے کے علاوہ خالد سہیل نے امریکہ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں عورتوں کے تئیں اپنائے جارہے متعصب اور غیر مساویانہ رویوں کو بھی غیر جانب داری کے ساتھ پیش کیا ہے۔

گویا خالد سہیل نے عورتوں کے مسائل کو سنجیدگی اور ہمدردی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ وہ مشرقی ماحول میں عورتوں کی مجبوری اور مظلومی سے لے کر مغرب کے آزاد اور کھلے ماحول میں زمانے کی ستم ظریفیوں اور صعوبتوں سے نبرد آزما ہونے والی، بہتر مستقبل اور پرامن معاشرے میں آزادی کا خواب دیکھنے والی اور مساویانہ حقوق کی علم بردار خواتین تک کے مسائل کو پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ انھوں نے تیسری دنیا اور پہلی دنیا کی عورتوں کے مسائل پر یکساں طور سے قلم اٹھایا ہے۔

عورتوں کی مظلومی اور اعتدال سے بڑھی ہوئی ان کی خودمختاری کے مسئلے سے ہٹ کر خالد سہیل نے عورت کے ایک اور مقدس روپ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے، وہ ہے عورت کے جذبۂ ممتا کی کہانی۔ اس موضوع پر انھوں نے تین کہانیاں لکھیں۔ اس کے علاوہ بھی کچھ کہانیوں میں ماں کا کردار موجود ہے۔ 'تسبیح کے دانے'، 'اپنے دور کے یوسف کی ماں' اور 'دھرتی ماں اداس ہے' میں مشرقی عورت کے ممتا کے جذبے کو موضوع بنایا ہے۔ ایک مہاجر بیٹے کی ماں کی محرومی، اس کی تنہائی کس طرح اس کے لیے روح کا زخم بن جاتی ہے، یہی پہلو ان کہانیوں کا موضوع ہے۔ بیٹے اور ماں کے رشتوں کی ان کہانیوں میں خالد سہیل کی ذاتی زندگی کے بھی کچھ عکس شامل ہو گئے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کہانیوں میں تجربات، خیالات اور احساسات کی آنچ بہت تیز اور موثر ہے۔

مغربی طرزِ حیات

خالد سہیل نے مغربی طرزِ حیات کے محاسن و معائب کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور مغرب کی زندگی کے مسائل کی جانب نشان دہی کی ہے، چونکہ افسانہ نگار ایک ماہرِ نفسیات ہیں، ان کا طرزِ زندگی مغربی ہے اور ان کے پاس مختلف قسم کے مریض اپنے اپنے مسائل سمیت علاج کی غرض سے آتے ہیں اس لیے وہ ان مسائل کا بہت ہی باریکی سے مشاہدہ کرتے ہیں اور اپنے افسانوں میں ان مسائل کو پوری مضبوطی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔'زندگی میں خلا' کی ڈونا مغربی طرزِ زندگی کی ایک زندہ مثال ہے جو ہر طرح سے اپنی زندگی سے مطمئن ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ رفتہ رفتہ اس کی زندگی ویران ہونے لگتی ہے۔ اس کے بچے اپنے کیریر اور آشیانوں کی تلاش میں باہر نکل جاتے ہیں۔ وہ اکیلی رہ جاتی ہے یہی تنہائی اس کی زندگی کا خلا بن جاتی ہے۔ مغربی ممالک میں Senior Citizen کا یہی المیہ ہے کہ تمام تر سہولتوں کے باوجود ان کی زندگی اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے خالی خالی رہتی ہے۔ اسی طرح 'جھکی ہوئی زندگی' کا ولیم مغربی زندگی کا ایک جیتا جاگتا کردار ہے جو بڑا اور عظیم مصنف ہونے کے باوجود تنہائی اور بیماری سے ہار جاتا ہے اور اپنی مرضی سے خود کو موت کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ صورت حال مشرق کے ماحول میں بہت زیادہ مانوس نہیں ہے۔ مشرقی معاشروں میں چونکہ افراد، مشترکہ نظامِ خاندان سے جڑے ہوتے ہیں اور آپسی تعلقات اور رشتوں کی ڈور اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ تمام تر کلفتوں اور پریشانیوں کے باوجود لوگ ایک دوسرے کے درد و غم میں شریک رہتے ہیں اور ذاتی اغراض سے قطع نظر ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ 'الجبرا یا جیومیٹری' بھی مغرب کے آزاد ماحول اور رومانوی پہلو پر مبنی افسانہ ہے جو وہاں کے آزادانہ رومانوی ماحول کو پیش کرتا ہے۔ 'رنگین لیبل کھوکھلے ڈبے' مغرب کی کھوکھلی اور ظاہر پرستی پر مبنی زندگی کا ایک بہتر نقش بناتی ہے۔ اس افسانے کی اہم کردار جیولی ہے جو اپنی موجودہ زندگی سے پوری طرح مطمئن نظر آتی ہے۔ دنیاوی جاہ و مرتبہ سے مرصع؛ لیکن اس کی زندگی میں ایک غیر معمولی واقعہ پیش آتا ہے اور اس کی ظاہر پرستی اور کھوکھلی زندگی کی عمارت کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں، اس کی خود اعتمادی کے رنگ

اڑنے لگتے ہیں۔ افسانے کے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ وہ زندگی جو اوپر سے بہت دل کش اور دل فریب معلوم ہوتی ہے اندر سے کس قدر کھوکھلی اور بے جان ہے۔ جب وہ اپنے بارے میں غور کرتی ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ مرتبہ اور شان و شوکت کا جو حسین دائرہ اس نے اپنے چاروں طرف کھینچ رکھا ہے وہ کتنا بے معنی اور مہمل ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے مغربی زندگی کے اس تاریک رخ کو دکھانے کی کوشش کی ہے کہ تمام تر آزادی اور کھلے ماحول کے باوجود وہاں کے سماج میں لوگوں کے چہروں پر ایک ملمع چڑھا رہتا ہے، وہ ظاہری طور سے مطمئن اور خوش نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت ان کی روح میں ہزار زخموں کے آشیانے ہوتے ہیں۔

نفسیاتی مسائل

نفسیات، خالد سہیل کا خاص موضوع ہے۔ انسان کے اندرون میں بسی دنیا کو انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ نفسیات، بذات خود ایک الجھی اور پھیلی ہوئی کائنات ہے جس کے ہزار پہلو اور سیکڑوں رنگ ہیں۔ انسان کے اندر آباد یہ دنیا اس کی ظاہری شخصیت اور اعمال و افکار کی سمت و رفتار کو متعین کرنے میں اہم کردار نبھاتی ہے۔ خالد سہیل چونکہ ایک ماہرِ نفسیات ہیں اور عملی طور سے اس مرض کے مریضوں کی مسیحائی کرتے ہیں اس لیے ان مسائل اور ان کی الجھی ہوئی گتھیوں کو بیان کرنے کے لیے ان کے پاس اچھا خاصا مواد ہے۔ وہ اس دنیا کے پیچ و خم سے واقفیت رکھنے کی وجہ سے اس موضوع کو بہتر طریقے سے پیش کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ اپنے بہت سارے افسانوں کی خاطر بہت سارے موضوعات و مسائل انھوں نے نفسیات کی دنیا سے مستعار لیے ہیں۔ جن افسانوں میں نفسیاتی مسائل کی گرہوں کو سلجھانے کی کوشش ہوئی ہے ان میں 'دو خبریں'، 'ہمزاد'، 'دیواروں پر لٹکی تصویریں'، 'مسیحا کا کرب' اور 'تعبیریں بتانے والی' خاص کہانیاں ہیں۔ 'دو خبریں' میں سلمان کی ساری پریشانی ایک مہاجر کی نفسیاتی کیفیت ہے جو مشرق و مغرب کے تضاد سے پیدا ہوئی ہے۔ 'ہمزاد' میں ایک عجیب نفسیاتی بیماری کو موضوع بنایا ہے اور اس بیماری سے پیدا ہونے والے اور مختلف انسانوں کی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ سارا موضوع نفسیات کی

طرح الجھا ہوا ہے اور انسان کے جسم میں فطری طور سے رونما ہونے والی تبدیلیوں، اس کے مضمرات و اثرات اور سماج کو متاثر کرنے والے عناصر کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ یہ کہانی انسانی جسم میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں، اس کے بدلتے جذبات و احساسات اور ذاتی تجربوں کو سمیٹتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ 'مسیحا کا کرب' میں خالد سہیل نے ایک ایسے حساس موضوع کو اٹھایا ہے جس پر عام طور سے انسانی نگاہیں نہیں پہنچ پاتیں۔ ڈاکٹر، جو سیکڑوں مریضوں کی مسیحائی کرتا ہے آخرکار اس کا بھی ایک درد، ایک جذبہ اور ایک احساس ہوتا ہے لیکن بسا اوقات ہم اس احساس کی شدت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ مسیحا، رفتہ رفتہ جذباتی سطح پر مریض سے قریب ہوتا ہے، مریض کا درد خود ڈاکٹر کی روح کا کانٹا بن جاتا ہے لیکن پیشہ ورانہ سطح پر ڈاکٹر مریض سے غیر متعلق رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ جذباتی اور پیشہ ورانہ مطالبے کا یہی تضاد مسیحا کا کرب بن کر اس کی روح کو زخمی کرتا ہے اور غیر محسوس طریقے سے مریضوں کا ڈاکٹر خود بھی ایک قسم کی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ 'تعبیریں بتانے والی' کا مسئلہ اس سے بھی اگلی منزل کی کہانی ہے جہاں سیکڑوں مریضوں کا علاج کرنے والی ڈاکٹر اور ان کے خوابوں کی تعبیریں بتانے والی بذاتِ خود ایک نفسیاتی بیماری کا شکار ہو کر علاج کی تلاش میں دربدر بھٹکنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

خالد سہیل انسانی نفسیات کا تجزیہ خوبی سے کرتے ہیں۔ عام طور سے وہ مظاہر سے گزر کر پس منظر کی دنیا کو دیکھتے ہیں کیوں کہ نفسیات کی دنیا میں دراصل پس منظر ہی مظاہر کی تشکیل اور تکمیل کی بنیاد ہوتا ہے۔ تحت الشعور، شعور کی ترتیب و تدوین کرتا ہے اور انسان کے افعال و کردار کے لیے محرکات پیدا کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک تحت الشعور میں پہنچنے والے جذبات و احساسات کی شناخت نہ کی جائے گی، انسانوں کے ظاہری اعمال اور ردعمل کو کما حقہٗ سمجھا نہیں جا سکے گا۔

فرد کی آزادی اور انتخاب کا حق

اس موضوع پر بھی خالد سہیل نے کئی افسانے لکھے ہیں۔ مشرقی معاشروں میں فرد کی آزادی کی کوئی خاص وقعت نہیں ہوتی بلکہ صحیح معنوں میں اس کی آزادی اور فکر، جمہور اور سماج کی

فکر کی تابع ہوتی ہے۔ فرد کی آزادی، اجتماعی آزادی کے سامنے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہی کلیہ انتخاب اور فیصلے کی آزادی پر بھی صادق آتا ہے۔ انفرادی فیصلوں کی آزادی، اجتماعی فیصلوں کے مقابل غیر اہم اور بے معنی ہے۔ برخلاف اس کے مغربی معاشروں میں فرد کی اہمیت، اس کے جذبات و احساسات، اس کی پسند و ناپسند اور اس کے انتخاب اور فیصلے کی آزادی کو فوقیت دینے کا چلن ہے۔ خالد سہیل نے چونکہ دونوں معاشروں سے زندگی کا تجربہ پایا ہے اس لیے ان کی کہانیوں میں فرد کی آزادی اور اس کے انتخاب کی آزادی کو مضبوطی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

'پگڈنڈیوں پر چلنے والے مسافر' میں انھوں نے ایسے مسافروں کا مسئلہ اٹھایا ہے جن کی فکر اور سوچ، معاشرے کی عام فکری روش سے الگ تھی، وہ ان راہوں پر نہیں چلے صدیوں سے معاشرہ، جن پامال راہوں سے گزر رہا تھا۔ ان مسافروں کو وہ پامال راہیں، منزلوں تک نہیں لے جا سکتی تھیں چنانچہ ان لوگوں نے فرد کی آزادی کے جذبے کو فوقیت دی، اپنی پگڈنڈی خود بنائی اور اپنے انتخاب کے حق کو استعمال کرتے ہوئے نئی پگڈنڈیوں کی طرف چل دیے۔ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ اس راستے پر کئی اور لوگ بھی اپنے اپنے معاشروں سے اکتائے ہوئے زندگی کا سفر طے کر رہے ہیں۔ فرد کی آزادی کی یہی پگڈنڈی آخرکار ایک دن شاہراہ بن گئی۔

'جزیرہ' فرد کی آزادی پر مشتمل افسانہ ہے جس میں ایک شخص اجتماعی زندگی کے رویوں اور معیار کے مطابق اپنی زندگی نہیں گزارنا چاہتا۔ اس جرم کی پاداش میں پہلے وہ پولیس کی گرفت میں آیا پھر ذہنی مریضوں کے اسپتال تک پہنچا اور بالآخر ایک دن اس کی موت ہو گئی۔ اس میں خالد سہیل نے طنزیہ انداز میں یہ ثابت کیا ہے کہ کس طرح ہمارا اجتماعی شعور، فرد کی آزادی کی راہ میں کانٹے بچھاتا ہے، اسے اپنی مرضی سے فیصلے کا حق نہیں دیتا اور آزادانہ طور سے اسے زندہ رہنے کے حق سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ 'ذات کے ٹکڑے' کا کردار بھی آزادی کے اسی جذبے سے سرشار ہے جس میں وہ اپنے خاندان، کنبے اور سماج کے لیے ننگ کا باعث ہے، سب اس سے نفرت کرتے ہیں اور اپنی بے جا ترجیحات اس پر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کسی کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ اس شخص کی مرضی، اس کی خواہش اور اس کی ترجیحات کو بھی سمجھنے کی زحمت اٹھائے اور ان کے تدارک کی کوشش کرے۔ 'شہوت بھری آنکھیں' میں کئی پہلو موجود ہیں۔ لیکن

اس کہانی میں انسان کی آزادی اور اس کی پسند و ناپسند کا مسئلہ پوری شدت سے ابھارا گیا ہے۔ یہ کہانی عورتوں کی آزادی سے متعلق ہے اور ساتھ ہی ساتھ فرد کی آزادی، خودمختاری اور آزادانہ طور سے زندگی گزارنے کے فیصلے کے حق کو پانے کی کوشش بھی کرتی ہے۔

افریقہ اور سیاہ فام لوگوں کے مسائل

خالد سہیل نے افریقہ کے ادب پر اچھا خاصا کام کیا ہے۔ انھوں نے 'کالے جسموں کی ریاضت' کے نام سے ایک ترجمہ شدہ کتاب شائع کی ہے، جس میں سیاہ فام ادب کے نمونے شامل ہیں۔ خالد سہیل، فکری طور سے رنگ، نسل، ذات پات، جنس غرض یہ کہ ہر قسم کے تعصبات سے پاک قلم کار ہیں، ان کے ہاں ایک سیکولر اور غیر روایتی نقطۂ نظر موجود ہے۔ استحصالی نظام کے خلاف انھوں نے ہمیشہ آواز بلند کی ہے، مسائل خواہ عورتوں کے ہوں اقلیتوں کے ہوں یا سیاہ فام لوگوں کے، انھوں نے ہمیشہ ہی اپنے قلم کی دھار تیز رکھی ہے۔ اسی نظریے کے پیش نظر خالد سہیل نے افریقی سماج میں سفید فام اور سیاہ فام، غلام اور آقا، جابر اور مجبور، حاکم اور محکوم عوام کے بنتے بگڑتے رشتوں، اخلاقی اور انسانی قدروں کی پامالی کو اپنا موضوع بنایا۔ یہ بات عالمی سطح پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ افریقہ میں سیاہ اور سفید رنگ کا تصادم خوف ناک صورت اختیار کر چکا ہے۔ وہاں کی سفید فام اقلیت، افریقہ کی قدیم اور مقامی آبادی کی اکثریت پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑتی ہے۔ مقامی باشندوں کو انسانوں کے عام حقوق سے بھی محروم رکھا گیا ہے۔ گوری اقلیت نے افریقہ کے تمام قدرتی وسائل پر آمرانہ اور غاصبانہ اقتدار قائم کر رکھا ہے، وہ ان قدرتی وسائل کا بھرپور استحصال کرتی ہیں۔ مقامی آبادی ان وسائل سے کوئی استفادہ نہیں کر سکتی، ان کے اوپر ہزار قسم کی پابندیاں عائد ہیں۔ بلکہ وہ تو عام انسانی حقوق، آزادی اور جمہوریت کی برکتوں سے بھی محروم ہیں۔ سفید فام اقلیت، ہندوستانیوں اور قدیم مقامی باشندوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں اور بندشیں کھڑی کرنے سے باز نہیں آتی۔ ان تمام مسائل پر خالد سہیل کی نگاہیں پہنچی ہیں اور انھوں نے ایک ذمہ دار ادیب کا فرض نبھاتے ہوئے اپنے افسانوں میں ان مسائل کو پوری مضبوطی کے ساتھ پیش کیا اور اردو افسانے کو ایک نئی جہت سے روشناس کرانے کا خوش گوار

فریضہ بھی انجام دیا۔ ’تاریخ کی چکی کے دو پاٹ‘ میں نسل کی بنیاد پر سیاہ فام اور سفید فام انسانوں کے تصادم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سفید فاموں کے ذریعہ ہونے والے صدیوں کے استحصال کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفرت کو اس افسانے میں بیان کیا ہے کہ سیاہ فاموں کے دل و دماغ میں اس استحصال کے خلاف کس قدر زبردست ردعمل پایا جاتا ہے۔ ’ریت کے محل‘ میں خالد سہیل نے اس بنیادی موضوع کو اٹھایا ہے کہ کسی بھی قوم کے معصوم بچے جو ہر قسم کے تعصبات سے بالاتر ہوتے ہیں، ان کے والدین ان کو متعصب بنانے میں کس طرح سے اپنا کردار نبھاتے ہیں، ان کی پرورش و پرداخت ایسے خطوط پر کی جاتی ہے کہ لاشعوری طور سے بھی وہ سفید فاموں کی بالادستی اور سیاہ فاموں کے ازلی غلامانہ کردار کو تسلیم کرلیں۔ ’آواز کی موت‘ میں بھی نسل پرستی کے مسئلے کی جانب اشارہ ہے۔ مقامی آبادی کا ایک بڑا حصہ گوروں کے لیے مخصوص کردیا گیا اور اب اس کے انخلا کے لیے مقامی باشندوں اور سیاہ فاموں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ مقامی اور سیاہ فام اپنی بے بضاعتی اور مجبوری کے پیش نظر اپنی دھرتی ماں کو چھوڑ ہجرت کرنے پر مجبور ہیں لیکن ایک شخص حسین، ناانصافی اور ظلم کے خلاف سینہ سپر ہوجاتا ہے اور فطری آزادی کا طلب گار ہوتا ہے بالآخر اس کی آواز بھی خاموش کردی جاتی ہے۔ یہ کہانی بھی ان تمام مظلوموں کی داستانِ حیات کو پیش کرتی ہے جن کو ان کی اپنی جڑوں سے اکھاڑ کر نئی بستیوں اور علاقوں میں زبردستی بسانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ذرا غور کیجیے تو اسرائیل اور فلسطین تنازعے کی ساری بنیاد ہی اسی اہم اور جذباتی مسئلے پر ٹکی ہوئی ہے۔ ’سفید کانٹوں کی دیوار‘ کو علامتی رنگ دیا گیا ہے اور عالمی سطح پر کی جانے والی سیاست کا نقاب اتار پھینکنے کی کامیاب کوشش ہے۔ انڈین اور کلرڈ لوگوں کی کوششیں رنگ لاتی ہیں ان کی قربانیاں ضائع نہیں ہوئیں۔ اب حالات تیزی سے بدل رہے ہیں اور آخرکار سفید کانٹوں کی دیوار کم ہونے لگتی ہے۔ یہ افسانہ ایک امید افزا مستقبل پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

سیاسی احتجاج

مہاجر، خواتین اور سیاہ فام لوگوں کی زندگی کو اپنے موضوعات کے سہارے گویائی اور زبان دینے کے علاوہ بہت سارے ایسے مسائل ہیں، جن کا تعلق بیسویں صدی اور اکیسویں

صدی کی دنیا سے ہے۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی نے دنیا کو سیاست کے ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔ خلیجی جنگوں نے عالمی صورتحال میں تشویش ناک حد تک انقلاب پیدا کیا۔ اس میں اتحادی طاقتوں نے اپنے اپنے سیاسی مفادات کے تحت اپنے اپنے کردار ادا کیے اور پوری دنیا ایک نئے قسم کے سیاسی بحران کا شکار ہو کر رہ گئی۔ تیسری دنیا کے ممالک میں انسانی حقوق کے تحفظ، فرد اور قوم کے جذبۂ آزادی کی اہمیت اور قوموں اور ملکوں کے آزادانہ وجود پر گویا سوالیہ نشان لگ گیا۔ خالد سہیل نے 'امن کی دیوی' میں خلیجی جنگ اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ صورت حال پر اپنی توجہ اور فکر کو مرکوز کیا۔ جنگیں اور تصادم، انسانی ترقی کی راہ میں کیا کیا رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں، 'امن کی دیوی' اسی کا بیانیہ ہے۔ اس افسانے میں خالد سہیل نے بڑی صفائی، جرأت اور ہمدردی سے امریکہ کی خارجہ پالیسی پر احتجاجی تبصرہ کیا ہے اور ایک باامن اور جنگ مخالف ادیب کا فرض ادا کرتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی ہے۔ ان کا دوسرا افسانہ 'غدار' ہے، یہ افسانہ بھی سیاسی مصلحت کوشیوں اور ذاتی اغراض و مقاصد کے لیے عوام کے بے جا استعمال پر اپنا نقطۂ نظر واضح کرتا ہے۔ کسی بھی ملک کے سیاست دان، معصوم اور سادہ لوح عوام کو کس کس طرح سے جنگ کی بھٹی میں جھونک دیتے ہیں اور امن و آشتی کی آواز بلند کرنے والوں کی راہ میں کیا کیا رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں اس افسانے میں اسی نقطے کو مرکز میں رکھا گیا ہے۔ 'غدار' یوں تو دنیا کے ہر اس پڑوسی ملک کی کہانی ہے جہاں مذہب، رنگ، نسل اور مفاد پرستی کے حصول کی خاطر فوجی باہم مدمقابل رہتے ہیں لیکن بلاشبہ یہ کہانی برصغیر کے تاریخی، سیاسی اور جغرافیائی حالات کے پس منظر میں لکھی گئی ہے جہاں خالد سہیل نے مفاد پرست سیاست دانوں کو موضوع بنایا ہے اور ان کی فریب کاریوں اور انسانیت کش اقدامات کی نشان دہی کی ہے۔ آج دنیا کے بہت سارے علاقے اسی قسم کی سیاسی ریشہ دوانیوں کا شکار ہیں۔ اس نظریے سے اگر دیکھا جائے تو موجودہ حالات میں اس افسانے کی افادیت دوچند ہو جاتی ہے۔ ملک کے سیاست دان اپنے اپنے مفادات کی خاطر عوام میں کس طرح سے نفرت کے بیج بوتے ہیں، انھیں جنگ کے تاریک اور خوف ناک غاروں تک لے جاتے ہیں اور ایسے لوگوں کے خلاف صف آرا کر دیتے ہیں جو ان کے اپنے ہی بھائی برادر تھے۔ اس کہانی کا ہیرو سعید اپنی قوم کا ایک جانباز سپاہی تھا لیکن

مخالف ملک کی ایک خاتون کے انسانیت آمیز برتاؤ نے اسے جنگ سے توبہ کرنے پر مجبور کردیا۔ اس نے اجتماعی خودکشی سے توبہ کرلی لیکن اس کی قوم کے سیاست دانوں نے اسے غدار کہا اور مقدمہ چلاکر سزائے موت دے دی۔ خالد سہیل نے اس افسانے میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مذہب، رنگ، نسل اور علاقے کے تمام امتیازات اور اختلافات سطحی اور عارضی ہیں، دائمی رشتہ تو صرف انسانی جذبوں کی بنیاد پر ہی استوار کیا جاسکتا ہے۔ یہ افسانہ سیاسی احتجاج کی حیثیت سے تخلیق کیا گیا ہے، جو جنگ کا مخالف اور امن کا داعی ہے۔ اس کے علاوہ 'دھرتی ماں اداس ہے' میں خالد سہیل نے ایک ماں کی زبان سے دھرتی ماں کے دکھ کو بیان کیا ہے۔ یہاں ماں کا دکھ دراصل دھرتی ماں کا دکھ ہے کہ اس کے بچے ایک ایک کرکے اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، دھرتی ماں اندر ہی اندر ٹوٹتی رہتی ہے اور اس کی زندگی میں چین وسکون عنقا ہوجاتا ہے۔ دھرتی ماں کے جسم کے ٹکڑے ہوتے رہتے ہیں اور اس کے بچے آپس میں لڑلڑ کر ختم ہوتے رہتے ہیں۔ نتیجتاً ملک ترقی کے بجائے بدامنی، انارکی اور بدحالی کا شکار ہوجاتا ہے۔ ملک کی فضا میں جب حبس اور گھٹن زیادہ ہوتی ہے، امن اور شانتی کا خواب تعبیر سے ہم کنار ہوتا نہیں نظر آتا تو اس کے بچے نئی نئی زمینوں کی تلاش میں دھرتی ماں سے بچھڑ جاتے ہیں۔ خالد سہیل چونکہ نظریاتی طور سے امن کے پجاری ہیں اس لیے جہاں کہیں بھی ظلم وستم دیکھتے ہیں، ان مسائل پر قلم آزمائی کرتے ہیں اور اپنے قارئین کو اس مسئلے پر غور وفکر کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ انھوں نے اس کہانی میں دراصل قیامِ پاکستان اور اس کے پچاس سالہ سیاسی سفر کا علامتی انداز میں ذکر کیا ہے۔ یہ کہانی دراصل پاکستان کے سیاسی سفر کی ایک روداد ہے۔ وہاں کے عوام ذہنی اور جذباتی سطحوں پر کس قسم کے تصادم سے دوچار ہیں اور اندرونِ ملک حبس اور گھٹن بھرے ماحول میں زندہ ہیں یہی کش مکش 'دھرتی ماں اداس ہے' کا بنیادی موضوع ہے۔

خالد سہیل بنیادی طور سے انسان دوست، عالمی برادری، اخوت ومساوات اور حقوقِ انسانی کے علم بردار ہیں، وہ امن عامہ کے پیروکار اور تمام انسانی برادری کی یکساں ترقی کے خواہش مند ہیں۔ ایک انسان دوسرے انسان سے نفرت نہ کرے بلکہ آپسی محبت اور بھائی چارے سے زندگی کی رفتار کو تیز کرے اور ایسا کرکے ہی انسانی ترقی اور سکون کی نئی دنیا بسانے

میں کامیابی پائی جاسکتی ہے۔ اس خیال کو انھوں نے اپنے افسانوں میں خاص طور سے موضوع بنایا۔ خالد سہیل کے موضوعات کا دائرہ تنوع اور رنگارنگی لیے ہوئے ہے۔ عنوان بند موضوعات کے علاوہ 'ہمزاد' میں ایک نفسیاتی بیماری کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ 'کھلے اور بند دروازے'، 'سونے والے جاگنے والے' اور 'دیوتا' میں انسانی رشتوں کی کہانی اور انسانوں کے ارتقا کی داستان کہی۔ 'دیوتا' میں یہ دکھایا گیا ہے کہ فرد کی آزادی اور خوداعتمادی اس کو انسان سے بھگوان بنادیتی ہے، اسے دیوتا کے درجے پر فائز کردیتی ہے۔ 'شانتی... ایک فاحشہ' میں سکون اور اطمینان کو موت اور گمنامی کی علامت اور حرکت، اضطراب اور انقلاب کو ارتقا اور تسلسل کا استعارہ کہا گیا ہے گویا حیاتِ انسانی کے لیے سکون اور شانتی موت کی نشانی ہے اور حرکت وعمل زندگی کو رفتار دینے اور ترقی سے ہم کنار کرنے کا وسیلہ بنتا ہے۔ 'کھلے اور بند دروازے' میں مرد وعورت کے درمیان استوار رشتوں کو موضوع بنا کر یہ تاثر دیا ہے کہ مرد وعورت کے آپسی رشتے کس طرح سے انسانی شخصیت اور اس کے لاشعور کی تہوں کو کھولنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ساری انسانی شخصیت ایک پیچیدہ اور پراسرار کیفیت ہے۔ شخصیت سے ایک پردہ اٹھتا ہے تو دوسرے کئی دروازے بند ہوجاتے ہیں۔ گویا انسانوں کی تحلیل نفسی ایک پیچیدہ عمل ہے جس کا تجزیہ بے حد مشکل ہے۔ 'چند گز کا فاصلہ' تیسری دنیا کی پس ماندگی اور زندگی کی دھیمی رفتار کے مسئلے کو پیش کرتی ہے اور یہ تاثر دیتی ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک ترقی کے معاملے میں ایک خاص قسم کے خوف، ہچکچاہٹ اور اجنبیت سے دوچار رہتے ہیں، اس میں ان کے نفسیاتی پہلو کو بھی دکھایا گیا ہے۔ 'کچے دھاگے' میں ایڈز اور ہم جنسی سے پیدا شدہ ذہنی اور نفسیاتی ردعمل کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔

••

خالد سہیل کے افسانوی ادب کا فکری جائزہ

تخلیق کوئی بھی ہو اس کا فکری پہلو خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ فکری نقطۂ نظر اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ تخلیق کا خالق زندگی کی کن قدروں کا ترجمان ہے اور وہ زندگی کے بارے میں کس فلسفے کا قائل ہے۔ خیر وشر کی معرکہ آرائی میں کس قوت کی طرف داری کر رہا ہے۔ اس کی ہمدردیاں استحصالی طبقے کے ساتھ ہیں یا اس کی آواز غریبوں اور ظلم کی شکار عوام کی صدائے احتجاج بن کر ابھرتی ہے۔ وہ زندگی کو کن اصولوں اور نظریات کی روشنی میں دیکھنے اور پرکھنے کا خواہش مند ہے۔ اس کے ذہن میں امن اور انقلاب، آپسی میل محبت، بھائی چارہ، انسانی ہمدردی، عالمی برادری، مساوات اور پرامن سماج کی کون سی قدریں موجود ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہی خصائص اور اوصاف کسی قلم کار کو ترقی پسند یا رجعت پرست بناتے ہیں اور اس کی فکری سمت و رفتار کا تعین کرتے ہیں۔

خالد سہیل کے فکری اور فلسفیانہ نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے ان کے ناولوں اور افسانوں کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان کے مضامین اور انٹرویوز کو بھی سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ کوئی تخلیق کار یا فن کار جن قدروں کو عزیز رکھتا ہے اور زندگی کے تئیں جو فکری اور فلسفیانہ رویہ اپناتا ہے، اس کا اظہار مختلف طریقۂ اظہار کے وسیلے سے کرتا ہے۔ اس کی تخلیقی کائنات کے مختلف کرداروں اور

اشخاص کی معرفت اس فن کار کے فکری اور فلسفیانہ رویوں کی نشان دہی ہوتی ہے۔

خالد سہیل کی فکر کی مختلف سطحوں کو سمجھنے کے لیے ان کی افسانوی تخلیقات کے علاوہ ان سرمایوں کو بھی سامنے رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو ان کی فکر کو واضح سمت و رفتار دینے میں کسی نہ کسی حد تک اپنا کردار رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے ایک مضمون بعنوان 'شناخت کا سفر' کے مختلف اقتباسات کا ذکر بے محل نہ ہوگا ان اقتباسات کی روشنی میں خالد سہیل کے ادبی اور فکری ارتقا کو سمجھنے میں آسانی ہوگی:

".....پہلا دور بچپن اور لڑکپن کا تھا۔ چوں کہ میں پاکستان کے ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس لیے اسلام کو میں نے اپنی تمام تر روایات کے ساتھ موروثی طور پر قبول کرلیا تھا۔ خدا پر ایمان، آسمانی کتابوں اور رسول پر ایمان، فرشتوں اور قیامت پر ایمان بھی اسی کا حصہ تھے.....لڑکپن کے اس دور میں چند شامیں ایسی بھی تھیں جب میری یہ تمنا تھی کہ کاش میں ساری دنیا کو مسلمان بنا کر ان کی زندگی خوش حال اور پر سکون بنادوں۔

.....دوسرا دور اس وقت شروع ہوا جب میں ہائی اسکول اور کالج میں تعلیم حاصل کرنے لگا اور سائنس کا طالب علم ہونے کی وجہ سے اپنے ماحول کو منطق اور استدلال کے پیمانوں پر ناپنے لگا..... چنانچہ وہ سکون اور خوش حالی کی جنت جس میں میں بچپن اور لڑکپن کے کئی سال گزارے تھے میرے پاؤں کے نیچے سے کھسکنے لگی۔ میں جتنا سوچتا اتنا ہی مضطرب اور پریشان ہوتا۔

.....مجھے جلد ہی احساس ہوگیا کہ مسلمان قوم چودہ سو سال میں بیسیوں فرقوں اور گروہوں میں بٹ چکی ہے۔ یہ لوگوں کی ذاتی پسند کا سوال ہے اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں چاہے کوئی دیوبندی ہے بریلوی یا وہابی، اس کا اسلام کی بنیادوں سے کوئی واسطہ نہیں۔

.....تیسرا دور اس وقت شروع ہوا جب میں نے اسلام کی بنیادوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنے کی اور سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ جدوجہد پچھلے دور کی محنت سے زیادہ مشکل تھی۔

.....میری اس جدوجہد کا چوتھا دور اس وقت شروع ہوا جب میں اسلام اور قرآن کی پیچیدہ راہوں میں کھونے کے بعد دوسرے مذاہب کا سنجیدگی سے مطالعہ شروع کیا.....میں جس

قدر دیگر مذاہب کا مطالعہ کرتا اور ان کے پیروکاروں سے ملتا تو یہ یقین ہوتا کہ تمام پیغمبر ایک ہی سلسلے کی کڑی تھے جو اپنے دور کے نابغے تھے اور اپنے دل میں انسانیت کا درد رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ہم عصروں کو یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ نیک زندگی کے چند اصول ہیں جس میں خدا کی ذات اور قیامت پر ایمان لازمی اجزا ہیں اس کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی زندگی کے چند اصول ہیں جن پر عمل کرنے کی وجہ سے ہماری زندگی بہتر ہو سکتی ہے۔

.....اس دور میں میں یہ ایمان لانے لگا کہ تمام مذاہب کی بنیاد ایک ہے ہم سب کو آسمانی رہنمائی ملتی رہی ہے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ہمیں مادی زندگی کی بجائے روحانی زندگی پر زیادہ زور دینا چاہیے۔

.....میں اسلامی اقدار کی نسبت روحانی اقدار پر زیادہ توجہ دینے لگا۔ میرا یہ یقین ہونے لگا کہ ہر شخص کو اپنے مذہب پر اپنے طریقے سے عمل کرنے کی اجازت ہونی چاہیے اور اسے اپنے فلسفۂ خیر و شر پر اپنے طریقے سے عمل کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔

.....پچھلے چند سالوں میں میں اپنی شناخت اور نظریاتی ارتقا کے پانچویں دور میں داخل ہو چکا ہوں.....میرے اندازِ فکر میں کئی بنیادی تبدیلیاں آئیں۔

ایک تبدیلی یہ آئی کہ میری توجہ کا مرکز اسلامی، مذہبی اور روحانی اقدار کی بجائے انسانی اقدار بن گئیں۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ جو قدر ہم سب کو یکجا کرتی ہے وہ انسانیت ہے اس لیے میں سب سے پہلے انسان ہوں اور پھر کچھ اور۔

.....میرے خیال میں شخصی اور انفرادی آزادی اور فرد کے حقوق کا تحفظ ایک اہم انسانی قدر ہے ہر شخص کو یہ آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی جس طرح چاہے گزارے۔ اس آزادی میں باقی آزادیوں کے ساتھ مذہبی اور جنسی آزادی بھی شامل ہے۔ کسی حکومت یا مذہبی گروہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ لوگوں کی ذاتی زندگی میں مخل ہو۔ اگر وہ دوسروں کی زندگی کو متاثر نہ کرتی ہو۔

دوسری قدر دوسرے انسانوں کا احترام ہے۔ کسی شخص یا گروہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ

دوسروں سے ان کے بنیادی انسانی حقوق چھینے۔ اسی لیے میری نگاہ میں تعصب چاہے وہ رنگ و نسل زبان یا کسی اقلیتی گروہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ہو غیر منصفانہ ہے۔

.....میرے خیال میں ہم مجموعی طور پر ارتقا کے اس دور میں پہنچ چکے ہیں جہاں ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کے بارے میں فیصلے کر سکتے ہیں۔ اپنے لیے خیر و شر، نیکی بدی، گناہ و ثواب کے معیار مقرر کر سکتے ہیں، ان پر عمل کر سکتے ہیں اور ان پر حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں کر سکتے ہیں۔

اسی طرح ہم پوری انسانیت سے ماضی کی غلط اور متعصبانہ روایات سے نجات حاصل کرنے میں ایک دوسرے کا تعاون کر سکتے ہیں۔

.....اب میری زندگی کا مرکز اپنے علم اور تجربے کو فروغ دینا، دوسرے انسانوں کو سمجھنا، ان کے حقوق اور ان پر ناانصافیوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنا اور ان کے خلاف جدوجہد کرنا ہے۔ میرے نزدیک اس وقت ہمارے دور کی سب سے بڑی قدر انسانیت کا احترام ہے اور ایک انسان کا دوسرے انسان کے حقوق کو پامال کرنا چاہے وہ انفرادی طور پر ہو یا اجتماعی طور پر، سب سے بڑا گناہ ہے۔

ہم جس طرف بھی دیکھیں ہمیں غیر منصفانہ نظام نظر آتے ہیں۔

عورتیں آج بھی دوسرے درجے کی شہری ہیں۔

کالے آج بھی اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

مذہبی گروہ آج بھی تعصب کا شکار ہیں۔

اور یہ تمام ناانصافیاں انسانوں کے ہاتھوں ہو رہی ہیں۔ اس میں کچھ جہالت شامل ہے، کچھ تعصب ہے اور کچھ خود غرضی۔

میرا ایمان ہے کہ اگر ہم انسانیت کو بنیادی قدر سمجھیں اور اس کی فلاح کے لیے اپنی کوششیں مرکوز کر دیں تو ہمارے اختلافات آہستہ آہستہ خود ہی ختم ہو جائیں گے۔"[18]

---

18. بھگوان، ایمان، انسان: ص:20-10

اس طویل اقتباس کی مدد سے ہمیں خالد سہیل کے فکری سفر اور ان کی فکری جہت کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے، اس کے علاوہ ماہ نامہ 'شاعر' میں خالد سہیل نے ادب کے فلسفے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کیا ہے:

''میری نگاہ میں ادب تخلیق کرنا اپنے سچ کو تلاش کرنے اور پھر اس سچ کو تخلیقی انداز میں قارئین کے سامنے پیش کرنے کی عاجزانہ کوشش رہی ہے۔ میری تخلیقات ساری عمر، میرے قارئین اور دیگر ادیبوں کے درمیان تخلیقی پل تعمیر کرتی رہی ہیں۔ میں نے ہمیشہ اپنے خوابوں اور آدرشوں کے مخلصانہ اظہار کو صنف کے چناؤ سے زیادہ اہمیت دی ہے، اسی لیے میں نے بہت سی اصنافِ سخن میں تخلیقی اظہار کیا ہے۔

.....میں ایک مسلمان خاندان اور معاشرے میں پلا بڑھا لیکن ادب، سائنس اور فلسفہ پڑھنے اور زندگی کے بارے میں سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کے بعد میں نے خدا اور مذہب کو خیر باد کہہ دیا اور انسان دوستی Humanism کے فلسفے کو اپنا لیا۔

.....ایک لکھاری ہونے کے ناطے میرا آدرش اپنے سچ کو تلاش کرنا اور اس سچ کا تخلیقی اظہار کرنا ہے اور ایک ماہر نفسیات ہونے کی وجہ سے میرا مقصد خدمتِ خلق کرنا ہے تاکہ انسانوں کے نفسیاتی مسائل کم ہوں اور وہ ایک صحت منداور پرسکون زندگی گزار سکیں۔ میں ساری دنیا کے انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے امن کے خواب دیکھتا رہتا ہوں۔[19]

ان دونوں اقتباسات اور خالد سہیل کے افسانوی ادب کی روشنی میں ان کے فکری پہلوؤں کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ بات بہت واضح انداز میں سامنے آتی ہے کہ خالد سہیل سیکولر قدروں اور انسانی جذبات سے ہمدردی رکھنے والے قلم کار ہیں۔ وہ استحصالی اور تشدد پسند طبقے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور استحصال کا شکار طبقہ ان کی ہمدردیاں حاصل کر لیتا ہے، وہ کمزوروں کے حامی ہیں، آزادیٔ فکر و خیال کے علم بردار ہیں۔ دورنگی اور منافقانہ رویوں سے سخت متنفر رہتے ہیں۔ وہ ہر مظلوم اور کمزور کے ساتھ کھڑے رہتے ہیں، ان کا قلم ان

---

19. شاعر، ص: 10, 19

کے حق کی آواز بلند کرتا رہتا ہے۔ عورتوں اور کالوں کے حقوق کی پامالی سے ان کی روح مضطرب ہو جاتی ہے۔ خالد سہیل مذہب کی ظاہر پرستی اور نمائش سے متنفر رہتے ہیں اور انسانیت کے حقوق، عالمی برا.ری اور امن وشانتی کے پجاری ہیں۔ وہ مذہب کی ان رسومات اور عقیدوں میں یقین نہیں رکھتے جو انسانوں کو انسانوں سے برسرپیکار رہنے کے لیے مجبور کرتی ہے اور انسانیت کو جنگ کی دہلیز تک لے جاتی ہے۔ اپنی تخلیقات میں مختلف کرداروں کی وساطت سے انھوں نے اپنی فکر کو پوری وضاحت اور کمٹ منٹ کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر مقدس جیل میں ان کی فکر کے نمائندہ کردار ورانیکا، مارگریٹ اور حمیرا ہیں۔ یہ کردار خالد سہیل کی فکر کے ترجمان ہیں۔ انھوں نے 'مقدس جیل' میں اپنی فکر کے بارے میں لکھا ہے:

> میں نے اپنے مشرقِ وسطیٰ کے سفر اور اپنی ایک دوست کے سعودی عرب میں ملازمت کرنے کے تجربات اور احساسات کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں مشرقِ وسطیٰ اور خصوصی طور پر سعودی عرب کی معاشرتی زندگی پر سنجیدگی سے بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس خطے کی سیاسی اور مذہبی حیثیت اس قدر جذباتیت کا شکار ہے کہ وہاں کی داستانیں لکھنے والے انسانی حقوق اور خصوصاً عورتوں کے حقوق کا ذکر نہیں کرتے۔[20]

وہ مزید لکھتے ہیں:

> میں صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ماحول اور معاشرہ جہاں لاکھوں انسان انسانیت کی اعلیٰ ترین اقدار کی روشنی حاصل کرنے جاتے ہیں، انھیں شہروں کی گلیوں اور بازاروں میں آج بھی انسان ظلم کے اندھیروں میں زندگی گزار رہے ہیں۔[21]

ناولٹ میں مصنف نے کرداروں کی مدد سے سعودی زندگی کے تضادات کو اجاگر کیا

---

20. مقدس جیل؛ ص:20

21. ایضاً؛ ص:21

ہے۔ یہ تضادات وہاں کی زندگی کے ہر شعبے میں گہرائی تک پیوست ہیں۔ انسانی اعمال وافکار کا کوئی گوشہ نہیں جس پر دورنگی نے اپنا اثر ثبت نہ کیا ہو۔ کچھ مثالوں سے خالد سہیل کی فکر کی وضاحت ہو سکے گی۔ اس فکر نے ان کے اندازِ بیان میں طنز کی کاٹ شامل کر دی ہے۔

ناولٹ میں ایک مقام پر ورانیکا اور اس کے بوائے فرینڈ علی کی گفتگو کا یہ اقتباس دیکھیں:

> 'کتنی خوش قسمت ہوگی۔ میرا بس چلے تو وہاں جاؤں اور کبھی واپس نہ آؤں۔
>
> محمد کے قدموں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سو جاؤں'
>
> اس کی آنکھوں میں تقدس کے سائے لہرا گئے۔
>
> 'تو پھر جاتے کیوں نہیں'۔ میں نے مذاقاً کہا۔
>
> اس نے بیر کے دو گھونٹ لیے 'میں بہت پاپی ہوں'
>
> 'پاپی نہیں منافق' میں ہنس دی۔[22]

اسلام کے بہت سارے اصول وضوابط خالد سہیل کی فکر کا حصہ نہ بن سکے۔ ان سب کا ذکر انھوں نے خاص طنزیہ لہجے کے ساتھ کیا۔ ورانیکا کی زبانی ایک مقام پر خالد سہیل کی فکر یوں ظاہر ہوتی ہے:

> جسم کا سر سے پاؤں تک ڈھکے ہونا ضروری ہے، مسلمان اسے ستر کہتے ہیں۔ عورت کو صرف چہرہ، ہاتھ اور پاؤں ظاہر کرنے کی اجازت ہے، البتہ مردوں کو صرف ناف سے گھٹنوں تک چھپانے کا حکم ہے۔ خدا جانے یہ قانون کس نے بنایا ہے۔[23]

بعض مقامات پر یہی متضاد کیفیات پیدا کر اپنی فکر کو یوں ظاہر کرتے ہیں۔

> سعودی عرب میں عورتوں کو کار چلانے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ حکومت

---

22. مقدس جیل، ص 181-180
23. ایضاً، ص: 185

انھیں ڈرائیونگ لائسنس ہی نہیں دیتی۔[24]

''نہیں، مکہ اور مدینہ میں انگریزی اسکولوں کی اجازت نہیں۔

وہ کیوں؟

وہ مقدس مقامات ہیں۔ وہاں صرف عربی میں تعلیم دی جاسکتی ہے۔[25]

''وہ شرطہ جس نے میری ساس اور سسر کو گرفتار کیا اسے پاسپورٹ پر عربی پڑھنا نہ آتا تھا۔[26]

ایک دفعہ وہ مدینہ گئی اور مسجد نبوی کی تصویر لینے لگی تو پکڑی گئی اور اس کا کیمرہ چھین لیا گیا۔ حکم صادر ہوا کہ اسلام میں تصویر لینے کی ممانعت ہے۔ جب وہ مسجد کے اندر داخل ہوئی تو چاروں طرف ٹی۔وی کے کیمرے نظر آئے جو دیواروں اور چھتوں پر نصب کیے گئے تھے۔ ٹی وی پر ہر روز نماز دکھائی جاتی تھی۔[27]

ورانیکا! کیا تم نے کبھی غور کیا کہ کرۂ ارض پر جتنے بھی پیغمبر آئے وہ سب مشرقِ وسطیٰ کے اسی چھوٹے سے ٹکڑے پر کیوں آئے۔[28]

نرسوں نے مجھے بتایا کہ وہ سعودی عرب میں تین مہینے رہنے کے بعد مسلمان ہو گیا تھا اور دو دفعہ شادی کر لی تھی۔ اسے شاید اسلام کی یہی چیز

---

24. ایضاً؛ ص: 191
25. مقدس جیل ؛ص: 195
26. ایضاً؛ ص: 196
27. ایضاً؛ ص: 198
28. ایضاً؛ ص: 205

سب سے زیادہ پسند آئی تھی۔[29]

یہ عبارتیں اوران کا طنز آمیز بیان خالد سہیل کی فکر کو زیادہ بہتر طریقے سے ثابت کرسکتی ہیں۔

موضوعات کے نقطۂ نظر سے خالد سہیل کے یہاں تنوع اور رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے خود کو کسی خاص موضوع یا مسئلے تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنی تخلیقات میں مختلف الجہات مسائل کو اپنے مخصوص فکری سانچے میں ڈھال کر قارئین کی نذر کردیا۔ خالد سہیل ایک کثیرالجہت فن کار ہیں موضوعات کی سطح پر بھی اور اصناف کی سطح پر بھی؛ سردست ان کا افسانوی ادب ہماری بحث کا موضوع ہے۔ خالد سہیل کی مختلف افسانوی تحریروں، مضامین اور انٹرویوز کی روشنی میں جس قسم کے فکری نقوش ابھرتے ہیں، ان میں ایک اہم رنگ حقیقت نگاری کا ہے۔

خالد سہیل عام طور سے چیزوں، مسئلوں، عقیدوں اور روایتوں کو اس کے اصلی رنگ اور حقیقی انداز میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس طرح نہیں جس طرح وہ عام طور سے دیکھی اور دکھائی جاتی ہیں۔ حقیقت نگاری اور حقیقت پسندی کی اس کوشش میں بسا اوقات ان کے لب و لہجے میں تلخی، بغاوت اور غصے کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے ایک افسانے 'جڑیں، شاخیں، پھل' کا اقتباس بے محل نہ ہوگا:

> .....میں ابو سے تنگ آگئی ہوں۔ اسلام اور پاکستان کے نام پر ناٹک
> زیادہ عرصہ نہیں چل سکتا۔ میرے لیے یہ دونوں الفاظ گالی بن چکے ہیں۔
> میرا بس چلے تو آج ہی گھر سے بھاگ جاؤں۔[30]

خالد سہیل نے اپنی تخلیقات میں حقیقت نگاری کو ایک فکر کی سطح پر برتنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے وہ مصلحت پسندی اور مصلحت کوشی نہیں کرتے بلکہ بیانیہ انداز کا سہارا لے کر اپنی فکر کو واضح کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی تخلیقات کے مطالعے کے دوران ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاتھ میں ایک کیمرہ ہے اور اس کی مدد سے وہ سارے سماج کی برائیوں اور خرابیوں کی

---

29. ایضاً؛ ص: 215-214

30. زندگی میں خلا؛ ص: 19

تصویریں دکھاتے چل رہے ہیں اور فیصلہ کرنے کے لیے خود ہمیں تنہا چھوڑ دیتے ہیں اب یہ بات قاری کی ذہنی وسعت اور کشادہ ظرفی پر منحصر ہے کہ وہ ان خرابیوں پر کس انداز سے ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ چند ایک افسانوں میں تو ان کا فکری رویہ بالکل واضح رہتا ہے لیکن بعض افسانوں میں سارا زور اس بات پر رہتا ہے کہ قاری اپنا ردعمل خود ظاہر کرے۔

خالد سہیل کی فکر کا ایک اور پہلو ان کا غیر متعصب اور سیکولر رویہ ہے۔ وہ اپنی تخلیقات میں غیر جانب داری کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے۔ مذہب، نسل، ملک، ذات پات اور رنگ کے امتیازات سے وہ بہت دور ہیں۔ اپنی کہانیوں میں ان کے وہی کردار زندہ اور فعال نظر آتے ہیں جو سیکولر قدروں کے ترجمان ہوں اور مختلف النوع تعصبات کی آلائشوں سے ان کا دامن محفوظ رکھا ہو۔ ایسے مقامات پر خود خالد سہیل کی ہمدردیاں سیکولر رویوں اور قدروں کی ترجمان ہوتی ہیں۔ 'نوح کے رشتہ دار' میں خالد سہیل نے ایک سوال اٹھایا ہے جو ان کے سیکولر قدروں کے تئیں ترجیحی رویے کی غمازی کرتا ہے:

> میں نے کسی غیر مذہبی شخص کو لوگوں کے دروازوں پر دستک دیتے نہیں دیکھا اور التجا کرتے نہیں سنا کہ تم مسجد، گرجا یا مندر مت جاؤ لیکن مذہب کے پیروکار اسے اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ ہر کس و ناکس کے دروازے پر دستک دے کر ہدایت کی تلقین کریں اور اگر لوگ ان کے منہ پر دروازہ بند کر دیں تو مایوس ہو جائیں۔[31]

خالد سہیل کا غیر متعصب اور سیکولر رویہ صرف مذہب اور عقیدے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا وہ مختلف تعصبات کی آلائشوں سے پاک اور مبرا ہیں۔ ملک و قوم کا مسئلہ ہو یا دو تہذیبوں کے تصادم کا، عالمی برادری کا موضوع ہو یا خواتین کے گوناگوں مسائل کا، جملہ مسائل کے محاسن و معائب پر ان کی دوررس نگاہیں رہتی ہیں اور یکساں تیزی سے وہ ان کا تجزیہ کرتے ہیں۔ لیکن ہر موقعے پر ان کا رویہ غیر متعصب اور غیر جانب دار ہی رہتا ہے۔ ان کے اس

---

31. زندگی میں خلا، ص: 72

سیکولر رویے کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ فی الحال اثباتِ مدعا کے لیے صرف ایک افسانے 'پاکی' کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جس میں خالد سہیل نے پاکستانی نوجوان کو چرس کے زیرِ اثر دکھلایا ہے۔ کہانی کار کے لیے یہ ذرا بھی مشکل نہ تھا کہ وہ افسانے کی بناوٹ میں معمولی ترمیم کردے اور انتہائی فن کاری سے کنیڈین نوجوانوں کو چرس اور منشیات کا عادی دکھلادے اور پاکستانی نوجوان کو معصوم اور بری الذمہ قرار دے، لیکن خالد سہیل کے غیر متعصب رویے نے انھیں ملک و مذہب کے تعصب سے بالاتر رکھا اور انھوں نے پاکستانی نوجوان کو مجرم اور منشیات میں ملوث دکھایا۔ کیوں کہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ مہاجرین اگر نئے ملک کے مزاج و ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتے تو ان کے لیے پاگل خانے یا منشیات کے کاروبار میں داخل ہوجانا چنداں تعجب کی بات نہیں۔ اور اس افسانے میں اسی نفسیاتی رویے کا فائدہ اٹھا کر خالد سہیل نے اپنی سیکولر فکر کو ایک واضح سمت عطا کی ہے۔ انھوں نے پاکستانی نوجوان کی چرس نوشی اور کناڈائی نوجوانوں کی شراب نوشی کا ذکر متوازی سطحوں پر کیا۔ یہی غیر متعصب اور سیکولر رویہ ان کی تحریروں کو اعتبار دیتا ہے۔

حقیقت نگاری اور سیکولر رویوں کے علاوہ ان کی تحریروں میں ایک نئے خاندان کی تشکیل کے فکری عناصر بھی جلوہ آرا نظر آتے ہیں۔ خاندان کے قدیم اور روایتی رشتوں سے الگ خالد سہیل ایک نئے نظامِ خاندان کی تشکیل کی پیروی کرتے ہیں جہاں خاندان کے قدیم اور خونی رشتے اپنی معنویت اور افادیت کھوتے جارہے ہیں۔ کہانیوں اور ناولوں میں ان کے بیش تر کردار اسی نئے خاندانی نظام کی تعمیر و تشکیل کی جدوجہد میں مصروف ہیں جہاں خون کے روایتی رشتے اپنی افادیت اور معنویت کھوتے جارہے ہیں اور بالکل ایک نئی قسم کے خاندان کی داغ بیل ڈالی جارہی ہے۔ مختلف ملکوں، تہذیبوں اور مذاہب کے پیروکار اور باشندے رنگ و نسل کا امتیاز بھول کر محض عالمی برادری اور انسانیت کے اعلیٰ تصور کو خوابوں میں سجائے حقیقی زندگی کی نقش گری کر رہے ہیں۔ 'اپنے ملک میں مہاجر' کا یہ اقتباس خالد سہیل کی اسی فکر کی وضاحت کرتا ہے:

.....اس کی تقریر کا حاصل یہ تھا کہ ہم میں سے ہر شخص کے دو خاندان

ہیں۔ پہلا خاندان جس میں ہم پیدا ہوتے ہیں اور ایک خاندان وہ جو ہم
اپنے لیے بناتے ہیں۔ پہلا خاندان ہمارے رشتہ داروں کا ہوتا ہے اور
دوسرا خاندان ہمارے دوستوں اور محبوبوں کا۔[32]

اس کہانی کے علاوہ بہت ساری کہانیوں میں خالد سہیل کے کردار اپنی روایتی زندگی اور قدیم رشتوں سے قطعِ تعلق کر ایک نئی زندگی اور نئے رشتوں کی تلاش میں مصروفِ عمل ہیں۔ ان کے ناولٹ کے تمام مرکزی کرداروں کی شخصیت اور نفسیاتی رویوں سے بھی یہی تصویر بنتی ہے۔ شہزاد ایک پاکستانی مسلمان ہے، جیولی کینیڈین اور عیسائی ہے۔ ابراہیم ایک تیسرے ملک کا باشندہ ہے۔ سنبل پختون مسلمان لڑکی ہے، اس کا دوست ہیری اور سہیلی لیزا کینیڈین ہیں۔ ورانیکا کینیڈین لڑکی ہے اس کی دوست اور ہمراز حمیرا ایک امریکن مسلم ہے۔ ورانیکا کا بوائے فرینڈ علی ایک ایرانی مسلمان ہے۔ گویا افسانوں اور ناولوں میں بیش تر کردار غیر متعصب نقطۂ نظر اور سیکولر قدروں کے ترجمان ہیں۔ وہ روایتی خاندان کے بندھنوں سے آزاد اور ایک نئے خاندانی نظام کی تعمیر و تشکیل کے لیے سنگ و خشت فراہم کر رہے ہیں۔ کرداروں کی اس کہکشاں میں ہر کوئی اپنے اپنے مذہب کا پیروکار ہے اور اپنے طریقے سے انسانیت کی قدروں اور انسانوں کی فلاح و بہبود کی خاطر جدوجہد کر رہا ہے۔ سب کا مقصد اور فلسفۂ حیات ایک ہے، اعلیٰ انسانی قدروں اور سیکولر معاشرے کی تشکیل کا خواب؛ جسے ابھی حقیقت سے ہم کنار ہونا ہے۔

خالد سہیل کے فکری ارتقا میں کئی مقام آتے ہیں۔ اپنی زندگی اور فکری سفر کے ان سنگ ہائے میل کا ذکر انھوں نے اپنے مضمون 'شناخت کا سفر' میں بڑی وضاحت اور بے باکی سے کیا ہے۔ یہ بات بھی کہی جا چکی ہے کہ خالد سہیل نے اپنے ہم عصروں کے برعکس، زندگی کے بہت سارے موضوعات و مسائل کو اپنی فکر کا حصہ بنایا ہے، مغربی طرزِ زندگی کی برکتیں بھی ان کے موضوعات میں شامل ہیں اور اس زندگی کی لعنتوں کو بھی اپنی مضبوط گرفت سے آزاد نہیں ہونے دیا۔ خالد سہیل اس قبیل کے ادیبوں اور دانشوروں میں شامل ہیں جو عصری زندگی کے تعلق سے

---

32. دھرتی ماں اداس ہے، ص: 42-142

سوالات پیدا کرتے ہیں اور زندگی کے بارے میں ایک مثبت اور موثر نقطۂ نظر رکھتے ہیں جس کی بدولت امکانات کی تازہ فصل تیار ہوتی رہتی ہے۔

موضوعات کی رنگارنگی، تنوع اور کثیر جہتی کے باوجود خالد سہیل کی تحریروں میں عورت، فرد کی آزادی اور ہجرت کے موضوعات مرکزی مقام رکھتے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ ان کی فکر انھیں بنیادی موضوعات کے اردگرد گردش کررہی ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ باقی موضوعات ضمنی طور سے شامل ہوجاتے ہیں اور یہ بنیادی مسائل کی حیثیت سے موجِ تہ نشین کی طرح زندگی کی فکر اور رفتار سے ہم آہنگ ہوتے رہتے ہیں۔

عورتوں کی آزادی کا مسئلہ بھی فرد کی آزادی اور حقِ انتخاب سے مربوط ہے۔ خالد سہیل کا یقین ہے کہ عورتیں خواہ مشرقی سماج میں ہوں یا مغربی، ہر جگہ استحصال اور تعصب کا شکار ہیں اور دوسرے درجے کی شہری سمجھی جاتی ہیں۔ اس بارے میں ان کا نقطۂ نظر، ان کی فکر اور ان کی پسند بہت صاف اور واضح ہے۔ وہ عورتوں کی آزادی، ان کی پسند و ناپسند اور ان کی مذہبی، تہذیبی، معاشی اور جنسی آزادی کے قائل ہیں۔ عورتوں کی آزادی کا جذبہ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ بعض اوقات یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ حدِ اعتدال سے تجاوز کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس عمل کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے کہ وہ اپنے کرداروں کی ذات میں چھپے ہوئے لاشعور کو ابھارتے جاتے ہیں اور شخصیت کی تہ در تہ پرتوں کو قاری کے سامنے کھولنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ مختلف ناولوں اور افسانوں میں، ان کی فکر کے غماز ان کے کردار ہیں جو حیات و کائنات کے بارے میں ان کی فکر کو واضح کرتے ہیں۔ ان کے یہاں عورت ہر رنگ میں جلوہ گری کرتی رہی ہے، کبھی وہ 'تسبیح کے دانوں' اور 'اپنے دور کے یوسف کی ماں' کی بالکل مشرقی روایات و اقدار میں جکڑی ہوئی ماں ہے، کبھی مغربی طرزِ حیات اور معاشرت کی دین 'زندگی میں خلا' کی ڈونا: جو سینیر سٹیزن کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے تنہائی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ ان کے ہاں سنبل، ورانیکا اور جیولی مختلف اور متضاد معاشروں کے مسائل کے ساتھ آتی ہیں۔ سنبل ایک ایسی خاتون ہے جو روایتوں سے متصادم اور ایک نئی زندگی کی تلاش میں سرگرمِ عمل لیکن فیصلے کے وقت اپنے

لاشعور میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ ورانیکا، معاشی آزادی کی خواہش منداور جیولی، انسانیت، محبت، شرافت اور ہمدردی کی پاس دار اور مادرانہ جذبے سے سرشارلڑکی ہے۔ 'دوکشتیوں میں سوار' کی فوزیہ جنسی اور معاشی آزادی کی خواہاں ہے۔ 'شہوت بھری آنکھیں' کی کیرن، فوزیہ سے بھی زیادہ باغی، اپنی روایات واقدار سے شاکی ومتنفر اور آزادانہ شخصیت کے اظہار کی کوشاں ہے۔ جنسی آزادی کے نقطۂ نظر سے وہ فوزیہ سے زیادہ بے لگام، حدِ اعتدال سے بڑھی ہوئی، بغاوت کی آخری حد پر کھڑی ہوئی ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی روایات واقدار سے ہر قیمت پر دامن کش ہونا چاہتی ہے لیکن عورتوں کی معاشی اور جنسی آزادی کی راہ میں فوزیہ اور کیرن کے علاوہ بھی کچھ ایسے کردار ہیں جو ایک معتدل، درمیانہ اور سلجھا ہوا رویہ لے کر سامنے آتے ہیں۔ 'برابر لیکن مختلف' کی عفیفہ، 'روایتوں کے شہر میں' کی معصومہ اور 'کچے دھاگے' کی شمسہ، دراصل ایسے کردار ہیں جو ایک متوازن اور ترقی پسند نقطۂ نظر کے حامل ہیں اور خالد سہیل کی اس فکر کی ترجمانی کرتے ہیں کہ:

.....میں اپنی ذات کو اس درخت کی طرح محسوس کرتا ہوں جس کی جڑیں
مشرق کی مٹی میں پیوست، توانائی حاصل کر رہی ہوں اور جس کی شاخیں
مغرب کی فضا میں جھولتی ہوئی تازہ ہوا میں سرشار ہوں۔[33]

عالمی برادری اور مساوات کا تصور بھی خالد سہیل کی فکر کا ایک خاص عنصر ہے۔ وہ عالمی سطح پر ایک نئے برادرانہ نظام کی تشکیل کا تصور رکھتے ہیں اور مساوات کا تصور بھی درحقیقت اس فکری نظام کا ایک ذیلی حصہ اور مربوط خیال ہے۔ گذشتہ صفحات میں یہ بات گزر چکی ہے کہ خالد سہیل ایک سیکولر اور غیر متعصب فن کار ہیں۔ ان کا یہی سیکولر رویہ انھیں اظہار کی جرات اور اسلوب کی بے باکی عطا کرتا ہے۔ ان کے اسی تصور کی بدولت عالمی برادری اور مساوات کا تصور نشوونما پاتا ہے۔ ورنہ جہاں تعصب اور جہالت کے تاریک بادل سماجی قدروں کو اپنی گرفت میں لے چکے ہوں اور انسانیت دور کھڑی تعصب وجہالت کی گرم بازاری دیکھ رہی ہو وہاں رواداری، انسانیت اور عالمی برادری کے تصورات کی کوئی گنجائش نہ نکل سکے گی۔ ناول اور افسانوں میں

---

33. دوکشتیوں میں سوار: ص: 11

عالمی برادری اور مساوات کی یہ فکر خاص انداز سے اپنا عمل دکھاتی ہے۔ شہزاد اور ابراہیم، جیولی، سنبل، لیزا اور ہیری، قتیل اور وانڈا، کیرن اور کرن، جورج شمسہ اور شعیب؛ دراصل مختلف و متضاد تہذیبی پس منظر رکھتے ہوئے ایک نئے برادرانہ نظام کی تشکیل کرتے ہیں جہاں اخوت و مساوات کا مرکزی خیال ہی انھیں رشتوں کی مضبوط ڈور میں باندھے ہوئے ہے، نسیم سید رقم طراز ہیں:

.....بلکہ یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے صحرا میں دور تک پھیلے ہوئے درد کے فاصلوں کو کس طرح مٹا دینا چاہتے ہیں۔ وہ فاصلے جو انسانوں کے درمیان رنگ، نسل اور روایت کی صورت میں حائل ہو گئے ہیں۔ وہ ایشیائی قوموں کا احساسِ پس ماندگی ہو یا افریقی عوام سے لپٹی ہوئی تعصب کی داستان؛ نقلِ مکانی سے پیدا ہونے والی الجھنیں ہوں یا نئی نسل پر اس الجھن کے اثرات؛ خالد کا رابطہ سب سے ہے۔ محبت ان کا بھی موضوع ہے لیکن وسیع تر معنوں میں ان کی محبت اپنی ذات سے بھی ہے، اس کائنات سے بھی جس میں وہ سانس لے رہے ہیں اور اس کائنات سے بھی جو ابھی دریافت نہیں ہوئی ہے جس میں بسنے والی مخلوق تاریخ کا جبر سہہ کے بھی حوصلے سے زندگی گزار رہی ہے۔[34]

گویا خالد سہیل نے اپنی نگارشات کے ذریعہ یہ فکر واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسانی معاشرے میں انسانیت اور برادرانہ رویوں کی قدر جلد یا بدیر قبول کرنی ہوگی تبھی انسانی معاشرہ مل جل کر ایک بہتر زندگی کے خوابوں کی تعبیر پا سکتا ہے۔

عالمی برادری اور انسانی اخوت و مساوات کی بنیاد پر ایک بہتر اور خوش آئند مستقبل کی تلاش میں خالد سہیل کی نگاہیں ہر اس گوشے تک پہنچتی ہیں جہاں انسانیت اور انسانی رشتوں کی شمعیں روشن ہیں اور ان تاریک گوشوں تک بھی رسائی حاصل کرتی ہیں جہاں انسانیت ،

34. www.welcome@drsohail.com

جمہوریت اور انسانی قدروں کی راہ میں نسل، مذہب، زبان اور ملک کی رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ خالد سہیل کا عزم ہر اس دیوار سے ٹکراتا ہے جو ان کی فکر کے حصول میں سدراہ بنتا ہو۔ وہ مہذب اور متمدن سماج کی تعمیر میں غلام اور آقا کی تمیز کو فسادِ آدمیت تصور کرتے ہیں۔ ان کے لیے یہ خیال بہت جاں کاہ ہوتا ہے کہ ایک انسان محض رنگ کی بنیاد پر دوسروں کا غلام رہے، اور سفید رنگوں والی اقلیت، کالوں اور سیہ فاموں کو استحصال کا شکار بناتی رہے اور ان کے تمام قدرتی وسائل پر حاوی و قابض رہے۔ خالد سہیل کی فکر اس ضمن میں واضح نظریہ رکھتی ہے کہ دنیا سے غلام اور آقا کا امتیاز ختم ہونا چاہیے۔ انسان پر انسان کی ناجائز حکمرانی اور محض رنگ اور نسل کی بنیاد پر بہتری اور بدتری کا رویہ ننگ آدمیت تصور ہے۔ 'بڈی'، 'تاریخ کی چکی کے دو پاٹ'، 'ریت کے محل'، 'آواز کی موت' اور 'سفید کانٹوں کی دیوار' میں خالد سہیل ایک واضح نظریاتی اساس رکھتے ہیں۔ ان افسانوں میں وہ خاموش تماشائی نہیں ہیں بلکہ ان میں وہ ایک مکمل وابستہ (Committed) ادیب کی حیثیت میں خود کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کہانیوں میں ان کی پسند و ناپسند اور جانب داری پوری طرح نمایاں ہے جن میں ان کی فکر یوں ابھرتی ہے کہ وہ نظام جو اپنی بالادستی کی چکی میں ہر کمزور اور ہر کالے کو پیس رہا ہے جلد یا بدیر اسے ختم ہو جانا ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ انسان اس جرم کی سزا بھگتے جو سرے سے اس کا جرم ہی نہ ہو۔ سیاہ فام نسل نے جس نفرت اور حقارت کے احساس کے ساتھ زندگی گزاری ہے خالد سہیل اسی جانب اشارہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی نگارشات میں فکری روش کی وضاحت کے لیے اپنے عہد کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔

اس طرح خالد سہیل کے ناولوں اور افسانوں کی روشنی میں ان کے فکری عناصر کو تلاش کیا جائے تو ایک واضح، روشن، ترقی پسند اور آزاد زندگی کا تصور ابھرتا ہے۔ اپنے فکری نقوش کو خالد سہیل نے جس طرح اپنی تخلیقات میں مربوط اور منظم طریقے سے پیش کیا ہے اس میں ایک ایسے سماج کی تشکیل ہوتی ہے جو استحصال سے پاک ہو اور فرد و قوم کی آزادی اور حقوق کی ضمانت دیتا ہو۔ ان کی فکر کا بیش تر حصہ مغربی طرزِ زندگی میں پرورش پا کر جوان ہوا ہے۔ وہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کا خواب بنتے رہتے ہیں جہاں نہ صرف قانونی اور سیاسی طور سے مقامی اور

پردیسی باشندوں میں کوئی امتیاز نہ ہو بلکہ اس کا عملی اظہار بھی دیکھنے کو ملے۔ مہاجرین نئی تہذیب اور نئے معاشرتی رویوں سے خائف نہ رہیں بلکہ اپنی امتیازی اقدار کو باقی رکھتے ہوئے نئے معاشرے کی قدروں کو اپنی شخصیت میں اتارنے کی کوشش کریں، نئی سماجی تنظیم کے ساتھ تصادم اور ٹکراؤ، اس کے ساتھ اجنبیت اور غیریت کا سلوک، مہاجرین کی شخصیت میں تضاد کے رویوں کو جنم دیتا ہے، ایسے رویوں سے دونوں ہی طبقوں میں عدمِ اعتمادی اور عداوت کا رجحان پرورش پاتا رہتا ہے اور بالآخر ایک دن 'پاکی' کی شکل میں رونما ہوتا ہے اور جہاں مہاجرین ایک خوش آئند مستقبل کی تلاش میں کھلے دل ودماغ اور عالی ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے مفاہمت اور یگانگت کا رویہ اختیار کرتے ہیں وہاں 'جڑیں، شاخیں، پھل' کے کردار سہیل کے روپ میں مشرق ومغرب کی تہذیب وتمدن کے حسین امتزاج سے اپنے مستقبل کی تعمیر میں کوشاں رہتے ہیں اور زندگی کے مثبت، تعمیری اور افادی نظریے کی کشتی پر سوار اپنی منزل مقصود کو پہنچتے ہیں۔

معاشرے میں فرد کی آزادی اس کا بنیادی حق ہے۔ آزادی کا یہ رجحان ہر طرح کی پابندیوں سے آزادی حاصل کرلینے کے جذبے کا احاطہ کرتا ہے، خواہ زندگی گزارنے کے طریقے کی آزادی کا مسئلہ ہو (ذات کے ٹکڑے، دوباپ) یا جنسی آزادی کی راہ میں رکاوٹوں کو دور کرنے کا (دوکشتیوں میں سوار، کنکر اور شہوت بھری آنکھیں) معاشی آزادی کا مسئلہ ہو یا ادبی اظہار کی آزادی کا (دریا کے اس پار، مقدس جیل) انتخاب کے حق کا مسئلہ ہو (کنکر) یا اپنی روایتی قدروں سے پیچھا چھڑانے کا (ٹوٹا ہوا آدمی)؛ خالد سہیل ہر قسم کی آزادی کے حق میں ہیں لیکن ایسی آزادی کے مخالف ہیں جو دوسروں کی آزادی کی راہوں میں کانٹے بچھائے اور سماج کو انارکی، بدنظمی اور بدعنوانی کی طرف لے جائے۔ جب تک سماج کے دیگر افراد کی زندگیاں فرد کی آزادی سے متاثر نہ ہونے لگیں وہ فرد کی آزادی کے قائل ہیں۔ یہی رویہ اور رجحان عورتوں کے بارے میں ان کے فکری رویے کی غمازی کرتا ہے۔ فوزیہ، کیرن، سنبل دراصل اسی نسوانی آزادی کے استعارے ہیں۔ ان کے خیال میں معاشی اور سیاسی نابرابری کی بنیاد پر کوئی معاشرہ صالح قدروں کی پرورش نہیں کرسکتا۔ جنوبی افریقہ کے نسل پرست سماج کے پس منظر میں لکھے گئے افسانے اس کا بین

ثبوت ہیں۔ دنیا میں امن اور مساوات کی بارش اسی وقت تک ہو سکتی ہے اور یہ زندگی اپنے باسیوں کے لیے اسی وقت جنت بن سکتی ہے جب تک سارا معاشرہ استحصال، رنگ و نسل کے امتیاز اور جنسی تفریق کے جذبے سے بے نیاز نہ ہو جائے۔ معاشی آزادی کے لیے سیاسی آزادی بھی ضروری ہے، ملکوں کو انسانی برادری کی فلاح و بہبود کے لیے ملک اور قوم کی ترجیحات سے بالاتر ہو کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ 'امن کی دیوی' اور 'غدار' اسی جذبے کے پس منظر میں لکھے گئے افسانے ہیں۔ جب تک انسانوں میں سیاسی، معاشی، اقتصادی اور جنسی نابرابری کا احساس باقی رہے گا ایک پرامن اور صالح معاشرے کی تشکیل کا خواب تشنۂ تکمیل رہے گا۔

••

خالد سہیل کے افسانوی ادب کا فنی جائزہ

گذشتہ صفحات میں خالد سہیل کے ناولوں اور افسانوں کی روشنی میں ان کے فکر و فلسفے کے خط و خال اور نقوش کو ابھارنے کی کوشش کی گئی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ان کی فکر و فلسفہ کے ان گوشوں تک رسائی حاصل ہو سکے جو ان کے افسانوں اور ناولوں میں مصنف کے عقائد، خیالات اور فلسفۂ حیات بن کر گردش کر رہے ہیں۔ خالد سہیل نے فکر کے تخلیقی اظہار کے لیے فن کی جن قدروں کا سہارا لیا ہے، افسانے اور ناول کی ہیئت میں تکنیک کے جو تجربے کیے ہیں زبان و بیان اور ابلاغ کی سطح پر تخلیق کار اور قاری کے درمیان رشتہ استوار کرنے کی غرض سے پیرایۂ اظہار کی خوبیوں اور دیگر اوصاف کو جس فنکاری کے ساتھ برتا ہے، ان میں جدت، تازگی اور نئے پن کے جو اضافے کیے ہیں، اس باب میں خالد سہیل کے انھی فنی پہلوؤں کو تلاش کرنا ہمارا مطمحِ نظر ہے۔

پیرایۂ زبان اور اظہار بیان کی اہمیت کا اظہار احتشام حسین نے ان لفظوں میں کیا ہے:

> فن میں وسیلۂ اظہار کی اہمیت اتنی ہی ہے جتنی مواد اور موضوع کی۔ بلکہ اس میں تو ایسا جادو ہے کہ کبھی کبھی یہ مواد کی سطحیت کا پردہ پوش بن جاتا ہے۔ اور زبان و بیان کے رسیا اسی کے چند گھونٹ پی کر مست ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو تنہا اسلوب پر عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے نہ اس کو نظر انداز کر کے۔[35]

گویا کسی بھی تخلیق کار کے فکر و فن اور موضوع و مواد کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک اس کی فکر جس میں فن کار اپنی تصوراتی اور مثالی زندگی کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ زندگی کے بارے میں اس کا فلسفہ، وہ بنیادی اقدار جن کا حصول اس کی زندگی اور زندگی کی ساری جد و جہد کا حاصل ہوتا ہے،

35. مثنو نامہ، ص: 302

اس کی اسی فکر کے سہارے قاری کے دل ودماغ تک رسائی پاتا ہے۔ دوسرے اس کی پیش کش کا انداز، تخلیق کا طریقۂ اظہار تا کہ قاری اور تخلیق کے درمیان ابلاغ کی خلیجیں حائل نہ ہوں اور مصنف کی فکر قاری تک صفائی اور وضاحت کے ساتھ پہنچ سکے۔ عام طور سے فکروفن کا حسین امتزاج لافانی شاہکاروں کی بنیاد بنتا ہے لیکن فکروفن، موضوع اور مواد کے پیش کش کے انداز کو لے کر ادیبوں اور فن کاروں کے درمیان ہمیشہ اختلاف رائے رہا ہے کہ فکر کو اولیت دی جانی چاہیے یا پیش کش اور اسلوب بیان کی دل کشی میں فن کاری اور کاری گری کا اصل راز پوشیدہ ہے۔ خالد سہیل نے ایک انٹرویو میں کہا ہے:

> ویسے تو ہر فن کار کا تخلیقی تجربہ مختلف اور unique ہوتا ہے لیکن میرا مشاہدہ یہ ہے کہ اکثر شاعروں اور ادیبوں کے لیے فارم اور صنف کی اہمیت بنیادی ہوتی ہے اور موضوعات کی اہمیت ثانوی۔ وہ غزل، نظم، افسانے یا ناول کو اپنے تخلیقی اظہار کے لیے چنتے ہیں اور پھر اسی صنف میں اپنا تخلیقی اظہار کرتے ہیں۔ میرے لیے تھیم اور موضوعات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور فارم اور صنف ثانوی۔[36]

اس اقتباس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ خالد سہیل کے ہاں فکر کو فن کے مقابلے میں اولیت حاصل ہے۔ ان کی ترجیح ہوتی ہے کہ دل ودماغ میں پرورش پانے والے خیالات اور زندگی کے بارے میں مخصوص نظریات سے قاری آگاہ ہو، حیات وکائنات کے مسائل کو قاری ایک خاص زاویے سے دیکھنے کا عادی ہو۔ یہ آگاہی اور عادت اس وقت تک امکان سے باہر رہے گی جب تک قاری اور فن کار کے درمیان ابلاغ کا پل تعمیر نہ ہو سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ خالد سہیل کے افسانے اور ناولٹ میں ہم کو فکر اور فلسفے کی سطح پر نئے پن، جدت اور تازگی کا احساس ہوتا ہے ان کی فکر کی کاشت میں ہمیشہ نئی نئی کونپلیں پھوٹتی رہتی ہیں۔ ہمیں ترقی پسندی کی مختلف سطحوں سے واقفیت ہوتی ہے، عالمی برادری کے تصور، عورتوں، بچوں، اقلیتوں اور سیاہ فاموں

---

36. انٹرویو: سید عظیم (غیر مطبوعہ)

کے بنیادی حقوق کی حصول یابی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے یعنی موضوعات اور فکر کی متنوع اور رنگا رنگ کیفیات کی قوسِ قزح ابھرتی ہے لیکن اسلوب، انداز بیان اور زبان و محاورے کا وہ حسن نظر نہیں آتا جو قلب و نظر کے لیے مسرت اور انبساط کا سامان فراہم کر سکے۔ ہاں تکنیک کے تعلق سے یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ خالد سہیل نے اپنے تخلیقی اظہار کے دوران تکنیک میں مختلف قسم کے کامیاب تجربے کیے ہیں۔

پلاٹ

'ٹوٹا ہوا آدمی' کی کہانی سوچ سمجھ اور غور و فکر کیے ہوئے پلاٹ پر سجائی گئی ہے۔ اس کہانی کا مطالعہ اس نتیجے تک لے جاتا ہے کہ فن کار نے اپنے مقصد اور فکر کے تخلیقی اظہار کے لیے پلاٹ میں کئی سارے کرداروں کو تخلیق کیا ہے جو مرکزی کردار (شہزاد) کی شخصیت کو ابھارتے ہیں اور کش مکش کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ کہانی کا بنیادی تھیم یہ ہے کہ ایک تعلیم یافتہ پاکستانی نوجوان، بہتر مستقبل کے خواب اپنی پلکوں پر سجائے کینیڈا کا رخ کرتا ہے لیکن وہاں کے حالات کی ستم ظریفی اور قسمت کی نیرنگی کا شکار ہو کر جیل خانے اور ذہنی اسپتال میں جا پہنچتا ہے۔ بالآخر مختلف ضمنی اور معاون کرداروں کی مدد سے اس کی شخصیت میں خاموش انقلاب آیا اور وہ ایک ذمہ دار شہری کی زندگی گزارنے کی جد و جہد میں تھا کہ ایک طوفان نے اس کی کشتی کو پھر منجدھار میں لا کھڑا کیا۔ یہاں کہانی کے مرکز میں خالد سہیل نے مہاجرین کے مسائل، ان کے درد و کرب کی کہانی اور لحہ لحہ شکست و ریخت سے دوچار ان کی زندگی، قدیم روایات اور خاندان کے روایتی تصور پر فرد کی ڈھیلی ہوتی گرفت پر بھی فن کاری کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے اور یہ تاثر دیا ہے کہ جب ظاہری طور سے انسانوں کے لیے امید کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں تو فطرت نئی دنیاؤں اور نئے وسیلوں سے انسان کی زندگی میں داخل ہوتی ہے اور اس کی زندگی کو اجالا اور توانائی عطا کرتی ہے۔ ابراہیم کے کردار میں دیارِ غیر میں بسنے والے انسانوں کے لیے ایک مہربان اور محسن کی شفقت اور محبت نئے خاندان اور نئے رشتوں کی تعمیر و تشکیل کا علامیہ ہے۔

یہ بات یہاں کہی جاسکتی ہے کہ خالد سہیل کو کہانی کہنے اور کہانی کے رکھ رکھاو کا خاصا قرینہ آتا ہے۔ کہانی کے مرکزی کرداروں کے علاوہ چند اور غیر اہم ضمنی کردار زیبِ داستاں کے لیے قصہ کو رفتار دینے، کش مکش کے عناصر کو ابھارنے اور مہاجرین اور مقامی باشندوں کے مسائل کو پیشِ نظر میں لاکر خود پسِ پشت چلے جاتے ہیں۔ کہانی کے عروج اور اختتام تک پہنچنے میں کہانی کار کو زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑی۔ واقعات کی ابتدائی کڑیوں نے مرکزی خیال تک پہنچادیا اور پھر کہانی اس عدمِ یقین کے جملے پر یوں اختتام پذیر ہوئی۔ 'لیکن پھر..... مستقبل کی کس کو خبر' مستقبل نامعلوم اور موہوم ہے، زندگی اسی طرح نامعلوم راستوں سے گزرتی ہوئی اپنی منزل خود تلاش کرتی ہے۔

'مقدس جیل' کا پلاٹ سیدھا سادا اور اکہرا پلاٹ ہے۔ ظاہری طور سے یہ کہانی رپورتاژ کے فارم میں لکھی گئی ہے اور اسی لیے اس میں پلاٹ کی گہرائی، کہانی کا زیر و بم اور عروج و اختتام کا تجسس کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کہانی کی راوی خود ورانیکا ہے اور سعودی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور تجربات پر اپنے نقطۂ نظر سے ردِ عمل ظاہر کرتی ہے۔ کہانی کی تکنیک بیانیہ ہے اور اس کی ساخت بہت واضح اور صاف ہے۔ بیان میں کسی قسم کا کوئی جھول اور الجھاو نہیں۔ اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ اس کہانی کے لیے پلاٹ قدرے کمزور چنا گیا ہے اور واقعات میں زیر و بم اور کش مکش کے فقدان کی وجہ سے تجسس اور اثر آفرینی میں مکمل طور سے کامیابی نہیں ہو پاتی۔

اس کے برخلاف 'دریا کے اس پار' کا پلاٹ ایک وسیع زندگی کے تانے بانے پر بنایا گیا ہے۔ یہاں زندگی کا ایک وسیع منظر نامہ موجود ہے جہاں پختون طرزِ حیات اور اس کی تمام اچھی بری قدروں اور روایتوں کے ساتھ ساتھ مغربی طرزِ حیات کی ڈھلی ڈھلائی دنیا کی مدد سے کہانی کو مرتب کیا گیا ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار دراصل ایک انتہائی مشرقی اور روایتی سماج کے ایک فرد (وہ بھی لڑکی) کے دوسرے انتہائی ترقی پسند، آزاد اور کھلے معاشرے کی جانب ہجرت کرنے اور داخلی تصادم کے ڈوبتے ابھرتے جذبوں کی کہانی پیش کرتا ہے۔ اسی لیے اس کا پلاٹ قدرے پھیلا ہوا ہے اور ایک وسیع تناظر میں زندگی کے نشیب و فراز اور اخلاقی اقدار کو بیان کرتا ہے۔ یہاں بھی خالد سہیل کی فکر کا وہی زاویہ موجود ہے کہ قدیم طرز کے خاندان اور قبیلوں کا تصور

دھندلا دکھائی دیتا ہے، خون کے رشتے اپنی معنویت کھو رہے ہیں، اس کے مقابل نئی دنیا میں نئے تعلقات اور رشتے اپنا وجود بڑی شدت سے محسوس کرا رہے ہیں۔ فیصل، سکندر خان کے کردار روایتی خاندان کی دھندلی پڑتی تصویریں ہیں جب کہ لیزا، ہیری اور ڈاکٹر آرمسٹرانگ کا وجود خونی رشتوں کی کشش پر غالب ہے۔

کردار نگاری

'ٹوٹا ہوا آدمی' میں کردار نگاری کے نقطۂ نظر سے خالد سہیل نے کچھ بہتر کردار تخلیق کیے ہیں۔ یوں تو اس ناول کا مرکزی کردار شہزاد ہے اور ساری کہانی اسی کی شخصیت کے پیچ وخم کے گرداگرد گردش کرتی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ کردار ایسے ہیں جو خالد سہیل کی باریک بینی اور قوت مشاہدہ کی عکاسی کرتے ہیں، مثال کے طور پر جیولی اور ابراہیم۔ ان دو کرداروں کے علاوہ بھی بعض ضمنی کردار پیش منظر پر ابھرتے ہیں اور کہانی کو رفتار اور کش مکش سے دوچار کر کے پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ سلیم، کرسٹین، ریچل اور رنجیت اسی نوعیت کے ضمنی کردار ہیں جو اپنے اپنے مسائل اور ترجیحات کے ساتھ کہانی میں اپنا کردار ادا کر جاتے ہیں۔ لیکن بنیادی طور سے شہزاد اس کہانی کا سب سے خاص کردار ہے اور کہنا چاہیے کہ کہانی کا نام بھی اسی کی شخصیت کی رعایت سے تجویز کیا گیا ہے۔ شہزاد کے علاوہ ابراہیم اور جیولی اس کہانی کو آگے بڑھانے اور شہزاد کی شخصیت کے نفسیاتی پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

شہزاد کا کردار ایک ایسے مہاجر کا کردار ہے جو ایک بہتر زندگی کی خواہش لیے ہجرت کے کرب سے دوچار ہوتا ہے لیکن بد قسمتی سے وہ نئے ملک کی فضاؤں میں شیر وشکر نہیں ہو پاتا۔ ہزار کوششوں کے باوجود اس کی شخصیت شکست وریخت سے دوچار ہوتی رہی اور وہ نئی نئی قسم کے مسائل اور آلائشوں میں گھرتا چلا گیا اور ایک ایسا موقع آیا جب اس نے اپنا ذہنی توازن کھو دیا۔ شہزاد ایک جذباتی طبیعت کا انسان تھا۔ جذباتی انتہا پسندی اس کی فطرت تھی۔ وہ محبت بھی ٹوٹ کر کرتا اور نفرت کا لاوا تو اس شدت سے ابلتا تھا کہ اس کی ساری شخصیت کو پگھلا دیتا تھا۔ وہ مزاجاً

سیماب صفت تھا۔ اس کی طبیعت اس کو بے چین رکھتی تھی۔ پابندیاں اور قوانین اسے بالکل بھی گوارا نہ تھے، وہ انھیں توڑنے کی کوشش کرتا تو قانون کی گرفت میں آجاتا۔ شہزاد کو یہ بات پسند ہی نہیں تھی کہ ایک انسان دوسرے انسان پر حکم چلائے۔ اسی لیے بغاوت اور حکم عدولی اس کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی۔ اس انتہا پسندی کا جو حشر ہوتا ہے وہ شہزاد کے ساتھ بھی ہوا۔ مشکلیں ہر قدم پر اس کے لیے چشم براہ رہتیں اور لگا تار مصیبتوں اور معصیتوں میں گھرے رہنے کی وجہ سے اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کا تضاد پیدا ہونے لگا تھا۔

شہزاد کے کردار میں ایک خاص موڑ اس وقت آیا جب وہ ایک بچے کا باپ بننے کے تجربے سے دوچار ہوا۔ رفتہ رفتہ اس کی شخصیت میں نفرت کی جگہ نرمی، محبت اور گداز نے لے لی اور شہزاد بھی حیرت انگیز طور سے یہ تبدیلی اور انقلاب محسوس کرنے لگا۔ کردار نگاری کے نقطۂ نظر سے شہزاد کا کردار ایک زندہ، متحرک اور حالات کی دین کہا جاسکتا ہے۔

شہزاد کا کردار بے چینی، اضطراب، بغاوت، سیماب پائی، حقیقت سے گریز اور اندرونی نفسیاتی کش مکش کی مختلف کیفیات سے شروع ہو کر سکون، سنجیدگی، حقیقت پسندی اور شخصیت کی گہرائی تک پہنچ کر مکمل ہوتا ہے۔ ابتداً اس کے کردار میں بغاوت کا جذبہ اس قدر شدید تھا کہ وہ روایتوں سے منحرف اور اس کے مختلف رسوم وقیود سے دست کش تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ بغاوت اور تلخی کی جگہ سنجیدگی اور ٹھہراو نے لے لی۔ وقت کی ضرب، عمر اور تجربے کے اضافے اور حالات سے ایک حد تک سمجھوتہ کرنے کی وجہ سے اس کی شخصیت اور کردار نے بلوغت کے مختلف زینے طے کیے۔ ان معنوں میں شہزاد کا کردار مثالی کردار نہ ہو کر ایک زندہ، فعال، متحرک اور جان دار کردار کی شکل میں سامنے آتا ہے جو مختلف واقعات اور حادثات سے ٹکرا کر اپنی شخصیت میں انقلاب اور تبدیلی پیدا کرنے میں کامیاب ہوا۔

شہزاد بظاہر روایتوں کا باغی اور رسوم وقیود سے منحرف تھا لیکن مکمل طور سے اپنے ماضی سے دامن کش بھی نہ ہو سکا تھا، اس کے تہذیبی، سماجی اور مذہبی اقدار اس کی شخصیت کے نہاں خانوں میں موجود تھے۔ اس کا ماضی، اس کا مذہبی اور روایتی طرزِ زندگی، اس کے تعصبات

لاشعوری طور سے اس کی شخصیت کی تہہ میں زندہ، متحرک اور باعمل تھے اور نئے معاشرے اور نئے ماحول کے تضاد سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو رہے تھے۔ اس کے کردار میں اس کا اجتماعی لاشعور ہمیشہ بیدار رہتا، اس کے روایتی تعصبات اس کے سامنے ہوتے ایک موقعے کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> شہزاد کا جی تو چاہا کہ اس کے منہ پر طمانچے مارے اور کہے: 'ایک تو کیتھی کی نرس نے مدد نہیں کی اور میں نے مدد کرنے کی کوشش کی تو بجائے شکریہ ادا کرنے کے ناراض ہو رہی ہو'۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ 'عورت ہے، کم عقل ہے، اگر مرد ہوتی تو دن کو تارے دکھا دیتا،' منہ پھیر لیا۔[37]

اس اقتباس سے شہزاد کا اجتماعی لاشعور سطح پر آجاتا ہے کہ عورتیں کمزور اور کم عقل ہوتی ہیں، ان سے الجھنے کی بجائے پہلو بچا کر نکل جانے میں ہی بھلائی ہے۔ یہ پوری نفسیاتی کیفیت مشرق کے اس رویے کی غماز ہے جہاں مردوں کی بالادستی سماج پر بدستور قائم ہے اور عورتیں جسمانی اور ذہنی طور سے ناقص مخلوق تسلیم کی جاتی ہیں۔

شہزاد کے کردار کو زندہ اور متحرک بنانے میں جیولی اور ابراہیم کے کرداروں کی خاص اہمیت ہے۔ کہانی میں جیولی اور ابراہیم کے کردار ہمدردی، خیر سگالی اور انسانی برادری کے عالمی تصور کے نمائندہ کردار ہیں۔ جیولی کا کردار ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے شروع ہوا تھا لیکن حالات نے پہلے اس کے دل میں شہزاد کے لیے ہمدردی کے جذبات بیدار کیے اور رفتہ رفتہ ہمدردی نے محبت کی شمع روشن کر دی اور بالآخر وہ شہزاد کے بچے ایڈم کی ماں بنی۔ حالانکہ شہزاد کے ساتھ جسمانی اور جنسی طور سے ملوث ہونے کی پاداش میں اس کا ڈاکٹری لائسنس منسوخ کر دیا گیا کیوں کہ وہاں کے اصول وضوابط کی روشنی میں ڈاکٹر اور مریض کا باہم دگر رومانوی طور سے ملوث ہونا جرم تھا۔ جیولی اس سزا کی تاب نہ لا سکی اور خودکشی کر موت کو گلے لگا گیا۔ اس کا کردار مغربی معاشرے کے اس تضاد کو ظاہر کرتا ہے کہ انسانی حقوق کی پاسداری کا دعویٰ کرنے والا یہ سماج بھی مختلف تضادات کا شکار ہے۔ وہ بہ ظاہر انسانی حقوق کے تحفظ کا دم تو بھرتا ہے لیکن انسانی جذبے

37. ٹوٹا ہوا آدمی؛ ص:58

سے کس قدر عاری ہے کہ جیولی کی موت کا سبب بن جاتا ہے۔ اپنی موت کی قیمت پر جیولی نے شہزاد کے لیے ایک ایسا ماحول اور راستہ تیار کر دیا تھا جس پر چل کر وہ ایک مخلص باپ اور ذمہ دار شہری کے فرائض کا احساس کر سکا۔

جیولی کے علاوہ ابراہیم کا کردار بھی شہزاد کی شخصیت کی نقش گری میں کچھ رنگ شامل کرتا ہے۔ ابراہیم ایک شفیق، مہربان دوست، جہاں دیدہ بزرگ اور انتہائی سنجیدہ، متحمل مزاج اور بردبار شخص کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ وہ نہایت بامروت اور بااخلاق آدمی تھا جو انسانیت کی اعلیٰ ترین قدروں کا متلاشی تھا۔ وہ صحیح معنوں میں خیر اور ہمدردی کا استعارہ تھا۔ اس کی شخصیت میں بزرگوں کی شفقت، رہنماؤں کی خصوصیات اور صوفیوں کی شخصیت کا ٹھہراو بیک وقت جمع ہو گئے تھے۔ وہ ایک ایسے نازک موڑ پر جب شہزاد کے لیے امید کے سارے دروازے بند ہو گئے تھے، خضرِ راہ کی حیثیت سے سامنے آیا اور اپنے مہربان رویوں اور انسانی اقدار سے شہزاد کے دل و دماغ میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو سکا۔ ابراہیم نے شہزاد کی بے معنی اور بھٹکی ہوئی زندگی کو ایک بامقصد راہ پر لگا دیا۔ اس ناول میں اس کے کردار کی عظمت یہی ہے۔

ناول میں شہزاد کے علاوہ جیولی اور ابراہیم دو ایسے کردار ہیں جو انسانی جذبات سے بھرپور اور دردمند دل رکھتے ہیں۔ یہ تینوں کردار خالد سہیل کے خاندانی فکری نظام کے نمائندے ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

> .....حیرانی کی بات یہ ہے کہ جب سارے نظام ناکام ہو جاتے ہیں اس وقت بعض دفعہ زندگی پر اسرار طریقوں سے منزلوں کی نشان دہی کرتی ہے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ جب انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر خلوصِ نیت سے قدم بڑھانا شروع کرتا ہے تو زندگی کے مہربان دروازے خود بخود کھلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ جب انسان پرانے رشتوں سے مایوس ہونے لگتا ہے تو نئے رشتے اپنا دامن پھیلا دیتے ہیں۔[38]

38. ٹوٹا ہوا آدمی، ص:20

اس فکر کی روشنی میں شہزاد کے کردار میں شکست وریخت کا عمل دراصل قدیم رشتوں سے اس کی بے اعتنائی اور عدم توجہی، اور نئے رشتوں سے خود کو ہم آہنگ کرنے اور نئے ماحول میں ڈھل جانے کی داستان بیان کرتا ہے۔ خالد سہیل نے قدیم خاندانی نظام کی بجائے نئے خاندانی نظام کو اپنی فکر کا حصہ بنایا ہے۔ یہ نیا رشتہ اور تعلق خون کے روایتی رشتوں سے زیادہ مضبوط، پائیدار اور زیادہ گہرائی کا حامل ہوتا ہے کیوں کہ اس رشتے میں مقامی لوگ نئے مہاجرین کا استقبال کرتے ہیں، ان کے ساتھ عزت سے پیش آتے ہیں، ان سے نئی چیزیں سیکھنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اور ایسی صورت میں دونوں طرف دوستی، خلوص، تجسس، حیرت اور خیر سگالی کے جذبات پرورش پاتے رہتے ہیں، ان میں باہمی اعتماد کی خوش گوار فضا پروان چڑھتی رہتی ہے۔ یہ رشتہ صحت مند بنیادوں پر شروع ہوتا ہے۔ اس طریقے پر یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں رہ جاتا کہ خالد سہیل نے شہزاد، جیولی اور ابراہیم کے کرداروں کی مدد سے ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جہاں مہاجرین کو مقامی لوگ خوش آمدید کہتے ہیں، اور ان کے ساتھ ہمدردی اور خیر سگالی کے جذبات روا رکھتے ہیں۔ دراصل یہ تینوں کردار قدیم اور خون کے روایتی رشتوں کے ٹوٹنے، بکھرنے اور نئے رشتوں کے استوار ہونے اور پروان چڑھنے کی کہانی کہتے نظر آتے ہیں۔

شہزاد کے کردار نے کہانی میں جو ارتقائی مراحل طے کیے ہیں ان میں جیولی کے ہمدردانہ اور ابراہیم کے مشفقانہ اور پدرانہ سلوک کے علاوہ وقت اور حالات کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ شہزاد کی شخصیت جس دوران انتہائی باغیانہ جذبوں سے عبارت تھی اس وقت وہ جوان تھا، جوانی کے جوش سے بھرپور اس کی شخصیت میں بغاوت اور سرکشی کا طوفان اٹھا کرتا تھا، کچھ تو یہ عمر کا تقاضا تھا اور کچھ بے راہ روی اور گمرہی کی دین؛ لیکن ایک طرف جب عمر نے اپنے اثرات مرتب کرنے شروع کیے، زندگی تجربات کی بھٹی میں تپ کر کندن بننے لگی اور دوسری جانب ابراہیم جیسے شفیق رہبر کی ہمراہی نصیب ہوئی تو اس کی زندگی کی کشتی خود بخود سنجیدہ اور پرامید راستے پر آ گئی۔ عمر کی مختلف منزلوں اور زندگی کے مختلف تلخ و شیریں تجربات سے گزر کر اس کی شخصیت میں ایک قسم کا ٹھہراؤ اور سکون پیدا ہو گیا تھا۔ اب وہ بے لگام اور بانکا جوان نہیں رہ گیا تھا بلکہ ادھیڑ عمر

کے ایک تجربہ کار شخص بننے کی منزل سے دوچار تھا۔ ابراہیم کی معیت میں گزرے بارہ برس اور باپ بننے کے خوش گوار احساسات نے بھی اس کی شخصیت میں تہہ داری، سکون اور تحمل کے جذبات کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطری عمر کے تقاضے، باپ بننے کے خوش گوار جذبے اور ابراہیم اور جیولی کے ہمدردانہ سلوک نے اس کی شخصیت اور کردار کو گہرائی اور زندگی بخشی۔ زندگی کے مختلف موڑ پر شخصیتوں کی یہ تبدیلی فطری رنگ رکھتی ہے۔ آخر ابراہیم بھی، جو شہزاد کا شفیق دوست اور خضرِ راہ ثابت ہوا، جوانی کے پندرہ سال جیل میں گزار آیا تھا، وہ خود شراب کا شوقین تھا اور نشے کی حالت میں اپنی بیوی کو زدوکوب کرنے سے باز نہ آتا تھا۔ رفتہ رفتہ جب عمر نے اپنا رنگ ظاہر کرنا شروع کیا تو وہ ایک ذمہ دار شہری بن کر اپنی شخصیت کو سنوارنے میں کامیاب ہوسکا۔ شہزاد کے کردار میں بھی یہی مراحل اور یہی منزلیں آتی رہیں اور آخر کار اس کا کردار ایک مثبت فکر کے ساتھ تکمیل کی منزل سے دوچار ہوا۔ شہزاد کے کردار نے صحیح معنوں میں بلوغت کے مختلف زینے طے کیے ہیں۔

'مقدس جیل' رپورتاژ کی ہیئت میں تخلیق کیا گیا ہے اور رپوتاژ کے جو عناصرِ ترکیبی ہیں ان میں کردار نگاری کو کچھ خاص اہمیت حاصل نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود خالد سہیل اس ناول میں کردار نگاری کے کچھ اچھے اور نمائندہ کردار تراشنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اگر ناول کے کرداروں پر نظر ڈالیں تو چند ہی کرداروں کی جدوجہد اور حرکت سے یہ ناول اختتام پذیر ہوتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار خود ورانیکا ہے، ورانیکا ہی پورے ناول کے کینوس پر چھائی ہوئی ہے، وہ اپنے نفسیاتی ردعمل کی بدولت کہانی میں کش مکش اور غور و فکر کے کچھ پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ دوسرے کردار ضمنی کرداروں کی حیثیت سے ابھرتے ہیں اور کہانی کے سلسلے میں معمولی سا پیچ و خم دے کر کہانی کو آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ ان ضمنی کرداروں میں مارگریٹ ہے جو انگلینڈ سے آئی ہے اور سعودی عرب کی دولت کی ریل پیل سے متاثر ہو کر نرس کے پیشے سے منسلک ہے، ایک اور کردار حمیرا کا ہے یہ بھی اسی پیشے سے تعلق رکھتی ہے اور ورانیکا اور مارگریٹ کی ہم خیال اور ہمراز ہے۔ اس کے علم اور تجربے سے فائدہ اٹھا کر ورانیکا اپنے تجربات کو پختہ تر کرتی

رہی ہے۔ایک اور کردار علی کا ہے۔علی، ورانیکا کا بوائے فرینڈ ہے۔وہ ایک ایرانی مسلمان ہے اور کناڈا میں مقیم ہے۔ سعودی عرب کے مزاج کا ترجمان، اسپتال کا ایڈمنسٹریٹر ہے جو خشک مزاجی، تند خوئی اور ڈکٹیٹر شپ کی جیتی جاگتی علامت ہے، انسانی جذبات اور احساسات سے بالکل عاری۔ورانیکا کی نگاہوں میں پتھر کا بت۔وہ سنگ دلی اور شقاوت کا پیکر ہے۔

ورانیکا اس ناول کا سب سے اہم کردار ہے جو مغربی طرز زندگی کی عادی اور اس کی روایتوں کے ساتھ سعودی عرب میں نرس کی ملازمت کرنے آئی ہے۔یہاں کے تضادات سے جب اس کی شخصیت ٹکراتی ہے تو اس عورت کے جذبۂ خودداری اور جذبۂ آزادی کو ٹھیس پہنچتی ہے جس نے ایک خوددار اور خود مختار عورت کی حیثیت سے سعودی عرب آنے کا فیصلہ کیا تھا۔یہ اندرونی تضاد اور کش مکش کسی بھی موقع پر ورانیکا کا تعاقب کرنا نہیں چھوڑتا۔وہ ایک روشن خیال اور آزاد خیال لڑکی ہے جو دوسرے مذاہب اور اس کے پیروکاروں کی زندگی کے پہلوؤں کو جاننا اور سمجھنا چاہتی ہے لیکن تضادات، منافقانہ رویوں سے اسے سخت نفرت ہے اور قدم قدم پر اسے انھیں رویوں سے واسطہ پڑتا ہے۔اسی کش مکش سے اس کے کردار کی تخلیق ہوئی ہے۔

ورانیکا ایک سیکولر اور غیر متعصب نقطۂ نظر رکھتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب وہ سعودی عرب کے قوانین اور وہاں کی سماجی بندشوں اور تضادات کا ذکر کرتی ہے تو دوسری طرف عربوں کی معصومیت، ان کی مہمان نوازی اور احترام کا کھلے دل سے اعتراف بھی کرتی ہے۔یہ اس کے کردار کو روشن خیالی اور سیکولر روایتوں کی سرحدوں تک لے جاتے ہیں۔جب سعودی طرز زندگی، خانگی معاملات اور ازدواجی رشتوں کے بارے میں اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کی اجنبیت دور ہونے لگتی ہے اور انتہائی حیرت واستعجاب کے عالم میں ان کی زندگی سے بے نام سی لذت حاصل کرنے لگتی ہے لیکن قدم قدم پر عورتوں کے حقوق کی پامالی سے اس کی شخصیت پارہ پارہ ہوتی ہے اور مردوں کے جارحانہ نقطۂ نظر سے اسے دلی تکلیف پہنچتی ہے۔وہ ایک سادہ لوح اور معصوم کرداروں والی شخصیت کے طور پر ابھرتی ہے جسے تضادات، منافقت، دورنگی اور تعصبات سے سخت نفرت ہے۔ہم خالد سہیل کی فکری جہات کو اس کردار کی روشنی میں

زیادہ بہتر طریقے پر سمجھ سکتے ہیں۔

ورانیکا کے مقابلے میں مارگریٹ کا کردار بے حد مختصر ہے لیکن وہ ایک ایسا کردار ہے جو سعودی عرب کے حکمرانوں کے لیے چیلنج ہے اور اس کے کردار کی بدولت قاری، سعودی حدود میں ایک نئے طرزِ زندگی سے متعارف ہوتا ہے، ایک ایسے ماحول سے اسے واسطہ پڑتا ہے جو جغرافیائی طور سے تو سعودی حکومت کا حصہ ہے لیکن تہذیبی طور سے انگلینڈ کا ایک جزیرہ: وہاں سعودی قوانین لاگو نہیں ہوتے اور امریکن، جرمن اور دوسرے مغربی ممالک کے باشندے ہزار آزادی سے اپنی زندگی جیتے ہیں اور سعودی حکومت دیدہ ودانستہ انھیں نظرانداز کرتی ہے۔ اس عمل سے سعودی قوانین کی دورنگی اور اس کا تضاد سامنے آتا ہے۔ یہ ایک طرح سے ذہنی غلامی کا استعارہ بن جاتا ہے۔ مارگریٹ کے کردار کی بدولت قاری کو عرب کی جنسی زندگی کے کچھ تجربات حاصل ہوتے ہیں۔ مارگریٹ ایک رومانوی اور جنسی طور سے کھل کھیلنے والی عورت کے کردار کے روپ میں ابھرتی ہے اور بین السطور میں اس کا کردار یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ حکومتیں لاکھ قوانین وضع کرلیں، انسانوں کے جذبۂ آزادی کو دبایا نہیں جاسکتا اور فطری جذبات اور خواہشات کی تسکین کے لیے انسان چور دروازے تلاش کر ہی لیتا ہے۔ اس کے کردار سے مغربی طرزِ زندگی کی ایک جھلک ضرور ملتی ہے کہ اہلِ مغرب کے رشتے کن بنیادوں پر استوار ہوتے ہیں اور کن بنیادوں پر تعلقات اپنی افادیت کھو دیتے ہیں اور شکست و ریخت سے دوچار ہوتے ہیں۔ مارگریٹ کے کردار کی بدولت سعودی عرب میں مغربی باشندوں کے طرزِ زندگی کا سراغ ملتا ہے۔

ناولٹ میں حمیرا کا جو کردار ابھرتا ہے اس کے مطابق وہ شکاگو میں رہنے والی ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال لڑکی ہے جو اپنی تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لیے نرس کے پیشے سے منسلک ہوئی ہے۔ وہ سماجی علوم کی طالب علم ہے۔ اس نے سعودی ملازمت اس غرض سے قبول کی کہ فیس کے لیے ضروری پیسوں کا بندوبست ہوجائے گا اور سعودی زندگی کے نشیب و فراز سے بھی تجربات کی وسعت میں اضافہ ہوگا۔ سعودی کلچر اور زندگی کے بارے میں حمیرا کی معلومات ورانیکا اور مارگریٹ کے مقابل زیادہ وسیع اور گہرے تجربات کی حامل ہیں۔ وہ ایک روشن خیال،

وسیع النظر اور تعلیم یافتہ مسلم خاتون کے کردار میں قاری کے سامنے آتی ہے۔ مسلم دنیا کے سیاسی اور سماجی حالات اور سعودی عرب کے معاشرتی اور مذہبی حالات کے بارے میں وہ معلومات رکھتی ہے اور وہاں کی تضاد بھری زندگی سے نالاں ہے۔ اس نے مغربی طرزِ حیات کی برکتوں سے اپنی شخصیت میں جاذبیت اور دلکشی کی شان پیدا کرلی ہے۔ وہ سعودی زندگی کے تضادات کی شاکی تو ہے لیکن اسلام کے فلسفۂ حیات اور مسلم دنیا کے رہن سہن اور طرز زندگی کے فرق کو بخوبی سمجھتی ہے۔ وہ اپنے تجربات اور علم سے ورانیکا کے علم میں اضافہ کرتی ہے اور اسلام کے بارے میں ایک معتدل اور متوازن نقطۂ نظر کی حامل ہے۔ اس کا ماننا ہے کہ مذہب کو جغرافیائی حالات اور معاشرتی رویے زیادہ متاثر کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں ایک ساتھ رہنے والے افراد خواہ وہ کسی مذہب کے پیروکار کیوں نہ ہوں، سماجی اور معاشرتی زندگی میں ایک دوسرے سے قریب رہتے ہیں۔

سعودی عرب کے بعض علاقوں میں غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع ہے۔ ورانیکا ایک عیسائی خاتون ہے اور اس بنا پر وہ مقاماتِ مقدس تک رسائی حاصل نہیں کرسکتی، حمیرا کے کردار کی بدولت ورانیکا نے ان دنیاؤں میں پھیلی ہوئی تاریکیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ حمیرا کی زبان سے ناول نگار نے کچھ ایسے جیتے جاگتے سوالات کھڑے کیے ہیں جو اندھی عقیدت رکھنے والوں کے ایمان وعقیدے کی ساری عمارت کو متزلزل کردیتے ہیں۔ حمیرا کا کردار مکے اور مدینے کی زندگی اور مسجدِ نبوی کے تضاد کو نمایاں کرتا ہے۔ حمیرا بھی ایک غیر متعصب، روشن خیال، سیکولر، انسانی قدروں کی پاسدار اور حقوقِ انسانی کے علم بردار کے کردار میں سامنے آتی ہے۔

علی کا کردار ایک ایسے فرد کا کردار ہے جو مشرق کے روایتی اور مذہبی ماحول میں پرورش پاکر جوان ہوتا ہے اور زندگی کی چکاچوند اسے مغرب تک لے جاتی ہے۔ مشرقی ماحول کا پروردہ اور ایک مذہبی ملک کا باشندہ ہونے کے سبب اس کی شخصیت جس طرح کے تضادات سے الجھتی رہی ہے وہ درحقیقت علی کا المیہ نہیں بلکہ یہ المیہ ہے اس نسل کا جو جوان ہے اور جس کی پرورش و پرداخت مذہبی بنیاد پرستی کے ماحول میں ہوئی ہے۔ غالباً اسی لیے اندھی عقیدت اس کے اجتماعی

لاشعور کا حصہ بن جاتی ہے۔ ارض مقدس کے بارے میں بے جا تعصبات اس کے شعور میں رچ بس جاتے ہیں۔ علی کی شخصیت مشرق و مغرب کے متضاد ماحول کی چکی میں پس کر تضادات کا آئینہ خانہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ وہ ارضِ مقدس کو لاکھوں انسانوں کی روحانی طاقت کا مرکز و منبع سمجھتا ہے لیکن خود امریکی زندگی کا قائل ہے۔ وہ عورتوں سے ناجائز رشتے رکھتا ہے، سور کے گوشت اور شراب کا شوقین ہے لیکن محرم اور رمضان کے مہینوں میں ان کاموں سے علیحدگی اختیار کر لیتا ہے۔ ناول میں علی کسی متحرک کردار کی شکل میں موجود تو نہیں ہے لیکن ورانیکا کے بوائے فرینڈ کی حیثیت سے ہمیں اس کی زندگی کے کچھ تضادات کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ضرور ملتا ہے۔

علی کی شخصیت کے متضاد پہلو اس طرز زندگی کی نشان دہی کرتے ہیں جہاں مشرقی نوجوان اپنی پیٹھ پر صدیوں پرانی روایتوں کا بوجھ لیے داخل ہوتے ہیں اور جب ان کا تصادم بالکل ایک نئی قسم کے ماحول سے ہوتا ہے تو روایتوں کے سارے اہرام ریت پر بنے ہوئے محل کی طرح زمین پر آ جاتے ہیں۔ روایتوں کے حصار سے نکل کر جب یہ نوجوان کھلی فضا میں آزادی کا سانس لیتے ہیں تو مذہب اور سائنس، روایت پرستی اور ترقی پسندی، عقائد و اوہام اور روشن خیالی کے درمیان ان کی شخصیت معلق ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ تشکیک اور ذہنی دباؤ کا شکار ہونے لگتے ہیں۔

ان کرداروں کے علاوہ ایک بے نام کردار بھی ہے جس کے طرز قول و عمل سے کہانی میں نئے رنگ ابھرتے ہیں اور ورانیکا، مارگریٹ اور حمیرا کے ردعمل کو بہتر طریقے پر سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ کردار اسپتال کے ایڈمنسٹریٹر کا ہے جو ایک سعودی شیخ ہے۔ یہ شیخ دراصل سعودی شہری زندگی کے مرد طبقے کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ عرب مزاج کی سختی اور درشتی کا استعارہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ نرسیں اسے فرعون اور ابوجہل کے تاریخی ناموں سے ملقب کرتی ہیں۔ اس شیخ کی نگاہ میں انسانی جذبات کی کوئی وقعت نہیں، دوسروں کی پریشانیوں اور تکالیف پتھر کے اس مجسمے کو موم نہ کر سکیں۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ملازم اور مالک کے درمیان غلام اور آقا کے رشتے کے علاوہ کوئی اور تعلق نہیں ہوتا۔

اس طرح 'مقدس جیل' میں ورانیکا، مارگریٹ اور حمیرا مختلف ممالک اور مختلف تہذیبی پس منظر کے باوجود کچھ مشترک خصوصیات رکھتی ہیں۔ وہ آزاد خیال ہیں، روشن خیال ہیں، آزادی اور اپنے حقوق کی حصول یابی میں مصروف رہتی ہیں۔ زندگی اور اس کی لذتوں سے ہم کنار ہونا چاہتی ہیں۔ دوسروں کے جذبات کا احترام کرنا جانتی ہیں اور انسانی ضرورتوں کے وقت آپسی تعاون سے اپنی تنہائی کے غم کو بانٹتی ہیں۔ یہ کردار ہمیں انسانیت کی اعلیٰ قدروں اور عالمگیر انسانی برادری کے ترجمان نظر آتے ہیں۔

'دریا کے اس پار' میں عورتوں کی آزادی اور خودمختاری کو ثابت کرنے کے لیے سنبل کے کردار کو کہانی کے مرکز میں رکھ کر اس کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے۔ سنبل ایک ایسی شخصیت کے طور پر ابھرتی ہے جو مشرقی ماحول اور اس کے طرزِ زندگی سے دل برداشتہ ہو کر مغرب میں جا بستی ہے اور ایک آزادانہ شخصیت کے طور پر خود کو ثابت کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ جب وہ مشرقی ماحول کی روایتوں سے نبرد آزما تھی تو اس کی نانی مورے ایک شفیق اور مہربان مربی کے طور پر اس کے ساتھ رہیں۔ ان کا سایہ اس کے سر پر ہمیشہ قائم رہا اور زندگی کے مختلف مراحل پر نانی مضبوطی سے اس کے ساتھ کھڑی رہیں۔ وہ سنبل کی ترقی کی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ اور ہر بندش سے مردانہ وار نکر لیتیں اور سنبل اپنے مقاصد سے شادکام واپس آتی۔ نانی کے کردار کو طاقت اور مضبوطی عطا کرنے میں ان کا قبائلی پس منظر ہمیشہ معاون رہا۔ خانہ بدوشوں کی آزادانہ زندگی کے بہت سارے عکس نانی مورے کے کردار کے خاص عناصر تھے اور نانی کے کردار سے تقویت پا کر سنبل کا کردار بھی خانہ بدوشوں کے جلالی اور جمالی مزاج کا مرقع بنا تھا۔

سنبل کے کردار کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ تو پاکستان سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا حصہ کناڈا سے، جہاں وہ ہجرت کر کے جا بستی ہے۔ وہاں نانی مورے کی شفقت اور مہربانی تو نہ تھی لیکن ہیری اور لیزا کی رفاقت نے اسے زندگی کی مشکلوں اور اس کے امتحانوں سے گزر جانے کا حوصلہ بخشا۔ پاکستان میں سنبل کی زندگی کا جو حصہ بسر ہوا اس کے نقطۂ نظر سے وہ ایک روشن خیال خاتون، آزاد فکر رکھنے والی اور ہر اس بندش سے ٹکرا جانے والی خاتون کی شکل میں سامنے آتی ہے

جو عورتوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بنتے ہوں۔ طالب علمی کے زمانے سے لے کر ملازمت تک اس مخصوص سماج میں جو بھی بندشیں اور رکاوٹیں متوقع تھیں ان سب پر اس خاتون نے فتح حاصل کی اور آزادانہ طور سے اپنی شخصیت کو مستحکم کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ مغرب کے دورانِ قیام بھی عورتوں کی آزادی، ان کی عزتِ نفس اور خودداری کا جذبہ سرد نہیں ہوا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مغرب کے آزاد ماحول نے سنبل کے جذبۂ آزادی کو اور بھی تیز تر کر دیا۔ نامساعد حالات کے باوجود اس نے خود کو مستحکم کیا اور عورتوں کی آزادی اور خودمختاری کی جدوجہد میں اپنا کردار ادا کرتی رہی۔ اس طرح سے سنبل خان ایک زندہ، متحرک اور فعال کردار کی شکل میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔ جس کی شخصیت میں پختون سماج کی غیرت اور خانہ بدوشوں کی زندگی کے تجربے یکساں طور سے مجتمع ہو گئے تھے۔ اس کی ذات دو مختلف تہذیبی روایتوں کی امین اور وارث ہے۔ اس نے پختون سماج کے روایتی طور طریقوں کے برعکس اپنی تعلیم مکمل کی اور ملازمت بھی کی۔ روایتی بیوی بننے سے بھی انکار کیا کیوں کہ اس کے خیال میں اس کا ہونے والا شوہر ناخواندہ اور جاہل تھا۔ اس نے اپنے محبوب کو حاصل کرنے کی خواہش میں ہجرت اور دربدری کا کرب بھی برداشت کیا۔ اس کے کردار کی یہی مضبوطی اور باوقار انداز اسے منفرد شخصیت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس ساری جدوجہد میں اور آگ کے دریا سے گزر جانے کی کوشش میں اس کی نانی مورے اس کے دوش بدوش کھڑی رہیں۔ بقول ظہیر انور:

> .....مورے کا کردار مختصر مگر ڈھلے ڈھلائے سانچے میں ہمارے احساس پر چھانے لگتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ مثالی کردار جو آزادی اور انحراف کی لے پر تیار ہوا ہے، ناول نگار کے لاشعور کا حصہ ہے۔[39]

مورے جیسے کردار کی تربیت کی چھانو میں سنبل کا کردار نشو و نما پا کر زیادہ مضبوط، توانا اور واضح ہو کر ابھرتا ہے۔ مغرب میں قیام کے دوران اس کے گرد و پیش کی دنیا جن لوگوں سے مل کر تیار ہوئی ہے ان میں لیزا، ہیری اور ساحرہ جیسے لوگوں کے جذبات و احساسات خاص طور سے

39. دریا کے اس پار، ص: 16

اس کی شخصیت کو متاثر اور منور کرتے ہیں۔

سنبل کے کردار کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے۔ بوسیدہ روایتوں اور تہذیبی اقدار سے باغی یہ لڑکی جب مغرب میں جا بستی ہے اور ایک آزاد شخصیت کے طور پر اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوتی ہے تو اپنے دوست ہیری کو شریکِ سفر بنانے کی ہمت نہ کر سکی۔ اس کا روایتی نسلی اثر اس کی شخصیت پر پوری طرح حاوی ہو گیا۔ تمام تر باغیانہ رویوں اور انحراف کے باوجود وہ اپنے لاشعور سے پیچھا نہ چھڑا سکی۔ فیصلے کا وقت آیا تو وہ تذبذب اور کش مکش کے بادلوں میں کھو گئی۔ ظہیر انور نے لکھا ہے:

> .....قبائلی روایت اور وراثت سنبل کے کردار کے شایانِ شان نہیں لیکن اس کے چھپے ہوئے اثرات اس کی انسانی کمزوری کو ہمارے سامنے واشگاف انداز میں پیش کرتے ہیں.....یہ سنبل کے کردار کا وہ المیہ ہے یا پھر بھرپور تنہائی جو اس کے انتخاب اور ذمہ داری کی پروردہ ہے۔[40]

مختصر طور سے یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ 'دریا کے اس پار' میں سنبل کا کردار دو تہذیبوں اور اس کے مختلف حالات کی چکی میں پس کر تیار ہوا ہے۔ اسی لیے اس کے کردار میں زیادہ جامعیت، زیادہ گہرائی اور زیادہ وسعت موجود ہے۔ خالد سہیل کے پہلے دو ناولٹ کے مقابلے میں 'دریا کے اس پار' کا یہ مرکزی کردار زیادہ منجھا ہوا ہے، اس کی شخصیت میں خود اعتمادی اور آزادانہ طریقے پر اپنی شخصیت کو مستحکم کرنے کا جذبہ زیادہ شدت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اپنے اس کردار کو زندگی، تب و تاب اور توانائی عطا کرنے کے لیے خالد سہیل نے پاکستان کے سرحدی علاقے میں بود و باش کرنے والے پختون سماج سے سنبل کے کردار کو منتخب کیا ہے۔ یہ بات عام طور سے تسلیم شدہ ہے کہ پختون اپنے مخصوص طرزِ حیات اور روایتی گرفت کی وجہ سے بنیاد پرست اور مذہبی سمجھے جاتے ہیں اس ماحول اور معاشرے میں عورتوں کی آزادی اور خود مختاری کے خواب بھی نہیں آتے لیکن خالد سہیل نے کمال فن کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سنبل کے کردار کو تخلیق کیا

---

40. دریا کے اس پار؛ ص: 15

اور قدم قدم پر اس کی سرپرستی اور حمایت کے لیے نانی مورے کے مختصر مگر مضبوط اور توانا کردار کی مدد سے سکندر خان جیسے روایتی فکر اور مذہبی سوچ رکھنے والے شخص کے شانہ بشانہ لا کھڑا کیا۔ سنبل نے اپنی خاندانی روایات کے برعکس نہ صرف تعلیم حاصل کی بلکہ ملازمت کے سہارے زندگی اور کائنات کی پیچیدگیوں اور باریکیوں کو سمجھنے کی خاطر میدان میں یکہ وتنہا کود پڑی۔ اس راہ میں اس کے حد سے بڑھے ہوئے خود اعتمادی کے جذبے کے علاوہ نانی مورے کی پرخلوص پشت پناہی کے سوا اور کوئی سہارا نہیں تھا۔ اپنے انتخاب پر قائم رہنے اور اپنے سماج کی روایتوں سے نبرد آزما ہونے کے بعد آزاد زندگی کی تلاش میں وہ مغرب میں جا بسی، وہاں کی زندگی کے چیلنج دوسری قسم کے تھے۔ اس طرزِ حیات کے مطالبات اور ترجیحات بدلی ہوئی تھیں، وہاں اس کی پشت پر نانی مورے کی شخصیت بھی نہیں تھی لیکن اپنی اندرونی طاقت اور حوصلے کے بل بوتے اس نے اپنے دوست فیصل سے علاحدگی اختیار کی اور آزادانہ طور سے اپنی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں مصروف ہوگئی۔ اس دوران مغرب میں رہنے والے کچھ مقامی باشندوں لیزا اور ہیری نے اس کے زخموں پر مرہم رکھا اور حیات وکائنات کی سنگلاخ چٹانوں سے اس کے وجود کو ریزہ ریزہ ہونے سے محفوظ رکھا۔

خالد سہیل کے بیش تر کرداروں میں، خواہ ان کا تعلق ناولوں سے رہا ہو یا افسانوں سے، ایک بات واضح طریقے پر سامنے آتی ہے کہ ان کے زیادہ تر کردار اپنی تہذیبی قدروں سے بغاوت کا رجحان رکھتے ہیں۔ بوسیدہ روایات کے حصار سے خود کو آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں ایسے کرداروں کی کثرت ہے جو اپنے مشرقی ماحول اور سماج سے فرار اختیار کر نئے ملک میں اپنی دنیا آباد کرنے میں منہمک ہیں۔ ان میں سے بعض کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں اور بعض ابھی نئے ماحول کے چیلنج سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ لیکن ایک اور چیز جو انھیں ایک لڑی میں پروتی ہیں اور جذباتی طور سے ان میں یگانگت کا رشتہ قائم کرتی ہے وہ زندگی کے تئیں ان کا روشن خیال اور ترقی پسندانہ فلسفۂ حیات ہے۔ خالد سہیل کے بیش تر کردار روایت اور مذہب کی پابندیوں سے یکسر آزاد نظر آتے ہیں، حیات وکائنات کے بارے میں ان کا نقطۂ

نظرِ عالمی برادری اور عالمی امن کے پیغام کی تشہیر کا ہے اور ایک ایسے سماج اور خاندانی نظام کی تشکیل کا جہاں قدیم اور خونی رشتے اپنی معنویت کھوتے جارہے ہیں اور ذہنی ہم آہنگی، یگانگت، مساوات اور خود انتخابی کی بنیادوں پر نئے رشتے استوار ہورہے ہیں اور ایک نئے نظامِ خاندان کی روایت کو پروان چڑھارہے ہیں۔ ورانیکا، حمیرا، شہزاد، ابراہیم، جیولی، سنبل، عنبر، لیزا، ہیری اور ساحرہ مختلف سماجوں اور تہذیبوں میں پرورش پاکر جوان تو ہوئے ہیں لیکن یہ تمام کردار اپنی اپنی روایتوں کے حصار سے آزاد ہوکر ایک نئے سماج اور نئے عالمی خاندانی نظام کی تشکیل میں سرگرمِ عمل ہیں جہاں نسل، رنگ، ذات پات، ملک، مذہب اور اس طرح کے دیگر مظاہر کے رنگ دکھانے کے مواقع نہیں کے برابر ہیں اور زندگی اپنے فطری اور قدرتی رنگ میں ترقی کے منازل طے کررہی ہے جہاں مساوات، عالمی برادری، عالمی انسان دوستی کے جذبات اور سب سے بڑھ کر فرد کی آزادی اور اس کے انتخاب کا حق سب سے بڑی اور اولین قدر ہے۔

خالد سہیل نے اپنے ناولوں میں بعض ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو اپنی اپنی ترجیحات کے ساتھ واضح نقوش اور خط و خال رکھتے ہیں۔ شہزاد، ابراہیم، ورانیکا، حمیرا، سنبل اور نانی مورے کے کردار تخلیق کرنے میں خالد سہیل نے فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ان میں ہر کردار کی انفرادیت اور فکری رجحان بہت واضح شکل میں ابھرتا ہے۔ ایک وجہ اس امر کی یہ ہوسکتی ہے کہ افسانوں کے بمقابل ناولوں میں کرداروں کے ارتقائی سفر کو پیش کرنے کی گنجائش نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ کیوں کہ ناول کا پلاٹ قدرے بسیط، پھیلا ہوا اور حیات و کائنات کے مسائل کو زیادہ گیرائی کے ساتھ پیش کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

ناولوں سے قطعِ نظر جب خالد سہیل کے افسانوں پر نظر جاتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ افسانوں کے نقطۂ نظر سے انھوں نے کوئی بڑا کردار تخلیق نہیں کیا۔ دراصل زندگی کے بارے میں خالد سہیل کا ایک خاص نقطۂ نظر ہے، وہ حیات و کائنات کے مسائل کو ایک مخصوص زاویے سے دیکھنے کے عادی ہیں اور زندگی کی اسی قدر کو پیش کرنے کے لیے کہانیوں کے کردار تراشتے ہیں۔ پھر بھی ان کی کہانیوں میں ایسے کرداروں کی نشان دہی مشکل ہے جو اردو افسانے کے بڑے

کرداروں کے سامنے پیش کیے جاسکیں۔

بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں میں کرداروں کے نام موجود نہیں ہوتے بلکہ مختلف ضمائر کی مدد سے کہانی کے مرکزی خیال کو پیش کر دیا جاتا ہے اور کہانی بغیر کرداروں کے، اپنی انتہا کو پہنچتی ہے۔ قطعِ نظر اس امر کے کہ ان کے افسانوں میں کردارنگاری کے عناصر کی قلت ہے اور خالد سہیل نے بڑے افسانوی کردار تخلیق نہیں کیے، کچھ ایسے کرداروں پر نگاہ ٹھہرتی ہے جنھوں نے اپنے ردِعمل اور شخصیت وسماج کے تضاد سے اپنی ذات کے نہاں خانوں کی سیر کرائی ہے۔ فوزیہ (دو کشتیوں میں سوار)، قتیل (ایک پاؤں میں زنجیر)، ڈون (تھکی ہوئی زندگی)، یوسف (برابر لیکن مختلف)، کرن (شہوت بھری آنکھیں) اور معصومہ (روایتوں کے شہر میں) کی شکل میں ایسے کردار موجود ہیں جو مشرق ومغرب کے تضاد، شخصیت اور سماج کے تضاد، نقل مکانی اور ہجرت کے مسائل کے تضاد، مذہبی، نسلی اور جنسی آزادی کے تضادات کو پیش کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ خالد سہیل کے افسانوں میں کردار نہ سہی لیکن ان کی آنکھ گردو پیش کی دنیا کو نہایت باریک اور بسیط ڈھنگ سے دیکھتی ہے اور ذات کی گہرائیوں میں بہت دور تک لے جاتی ہے۔ اور اس نقطۂ نظر سے خالد سہیل کردارنگاری کے باب میں بہت کامیاب نہ سہی لیکن مسائل اور زندگی کے نکات کو، اور زندگی کے بہت سارے زاویوں کو اپنے افسانوں میں پیش کرنے کا فریضہ ضرور انجام دیا ہے۔

اسلوب

خالد سہیل کے اسلوب اور اندازِ بیان کے مطالعے کے دوران یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اپنے فکروفلسفے کو قاری کے ذہن تک پہنچانے کے لیے انھوں نے نثر عاری کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ ان کے اندازِ بیان کو سیدھا سادا اور براہِ راست اسلوب کے ذیل میں رکھا جاسکتا ہے لیکن بعض مقامات پر زبان وبیان کی خوبیوں، محاوروں اور تشبیہوں کے اچھوتے استعمال سے قاری کے ذہن کو کریدنے، مسرت وانبساط کی فراہمی کے ساتھ ساتھ فکروخیال کی نئی نئی وادیوں میں لے جانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور قاری الفاظ ومعانی کی ایک نئی دنیا سے ہم کنار ہوتا ہے۔ یہ محاورے،

جملے اور تشبیہات نئے پن اور جدت کی خوبیوں سے مالا مال نظر آتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے:

تشبیہ کا استعمال

میں مدتوں شادی کے کچے دھاگے سے لٹکتی رہی۔ اس شادی کو محفوظ کرنا بالکل ایسا ہی تھا جیسے بچہ برف کے ٹکڑے کو محفوظ کرنے کے لیے اپنی ہتھیلی میں دباتا ہے۔[41]

موتیے کے پھولوں کو گوبھی کے پھول بنتے دیر نہیں لگتی۔[42]

اسے کیا بتاتا کہ پاکستان میں ہزاروں کیا لاکھوں لوگ اپنے جنسی جذبات کو ایسے بھول جاتے ہیں جیسے سٹھیائے ہوئے بزرگ اپنی عینک کہیں رکھ کر بھول جاتے ہیں۔[43]

تمھارے جسم کی منفرد خوشبو ہے، مٹی کی خوشبو کی طرح، ایسی مٹی جس پر پانی چھڑکا گیا ہو۔[44]

ایسی خاموشی جو حاملہ تھی لیکن کوئی نہ جانتا تھا کہ اس دفعہ اس کی کوکھ سے گلاب کا پھول نمودار ہوگا یا سانپ۔[45]

زندگی ایک گائے کی طرح ہے اور انسان اس کا بچھڑا۔ بچہ جتنا منہ مارتا

41. جڑیں، شاخیں، پھل، ص:24
42. ایضاً، ص:18
43. ایضاً، ص:25
44. ٹوٹا ہوا آدمی، ص:87
45. ٹوٹا ہوا آدمی، ص:164

ہے ماں اتنا ہی دودھ دیتی ہے[46]

مذکورہ بالا تمام مثالوں میں تشبیہ کا رنگ اچھوتا اور نرالا ہے اور زندگی کی حرارت اور آنچ میں تپا ہوا۔ جتنی بھی تشبیہیں استعمال ہوئی ہیں ان میں فطری پن کی خوبی موجود ہے اور قدرتی اشیا سے تشبیہی تعلق قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی صورت حال محاوروں کی ہے محض ایک مثال دی جاتی ہے:

کیا میں تمھارے والدین سے بات کروں؟

بطخ کی کمر پر پانی پھینکنے یا ریت پر پیشاب کرنے کا کیا فائدہ ہے[47]

خالد سہیل اپنے افسانوں اور ناولوں میں فلسفیانہ خیالات کی آمیزش سے سیدھے سادے اسلوب کی بے رنگی اور بے کیفی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فکر و فلسفہ اور زندگی کے تجربات سے حاصل کیے گئے فلسفیانہ خیالات کو پیش کر کے اسلوب کو جاذبِ نظر بناتے ہیں۔ ان میں بعض خیالات میں زندگی کی حرارت، گرمی اور تجربے کی صداقت موجود ہے اور بعض میں انسانی غور و فکر کے لیے نئے موضوعات کی جلوہ آرائی ہے۔ چند مثالوں سے اس دعوے کی وضاحت ہو سکے گی۔

ماں باپ روایتوں کے پرستار ہوتے ہیں اور بچے بغاوتوں کے، اور جو لوگ
بغاوت کا راستہ روکتے ہیں وہ خود بھی طوفانوں کی نذر ہو جاتے ہیں[48]

جنت الفردوس سے نکلنے اور آدم کے پھل چکھنے کی کچھ تو قیمت ادا کرنی ہی ہے[49]

کوئلے کے کاروبار میں سب کا منہ کالا ہوتا ہے کسی کا جلد کسی کا بدیر[50]

---

46. مقدس جھیل، ص:182
47. جڑیں، شاخیں، پھل، ص:20
48. روایتوں کے شہر میں، مشمولہ: دو کشتیوں میں سوار، ص:140
49. ٹوٹا ہوا آدمی، ص:34
50. ایضاً، ص:36

> لیکن اس دنیا میں صرف وہی شخص خوش رہ سکتا ہے جو اپنی ذات اور ماحول کے سب دکھوں سے بے حس ہو جائے۔ بے حسی اور خوشی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔[51]

> ورانیکا! کیا تم نے کبھی غور کیا کہ کرۂ ارض پر جتنے بھی پیغمبر آئے وہ سب مشرقِ وسطیٰ کے اسی چھوٹے سے ٹکڑے پر کیوں آئے۔[52]

اسلوب اور اندازِ بیان کا حسن اس وقت اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے جب خالد سہیل اس میں طنزیہ عناصر کی کاٹ بھی شامل کر دیتے ہیں۔ دیگر فن کاروں اور تخلیق کاروں کی طرح خالد سہیل بھی زندگی کا ایک تعمیری نقطۂ نظر رکھتے ہیں، اس کے حصول کے لیے کوشاں اور اپنے خوابوں کی تعبیر کے متلاشی ہیں۔ زندگی اور زندگی کے مسائل، اس کی مختلف قدروں اور قدروں کے تضاد اور تصادم سے وہ اپنے نقطۂ نظر، اپنی فکر اور اپنے فلسفے کو پیش کرتے ہیں۔ یہ بات متعدد بار دہرائی جا چکی ہے کہ خالد سہیل ایک غیر متعصب اور غیر مذہبی فن کار ہیں اور فرد کی آزادی کی راہ میں کسی بھی طرح کی قدغن اور پہرے داری کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ اپنے فکر و فلسفہ کو پیش کرنے کے لیے طنزیہ اسلوب کی راہ بھی اختیار کرتے ہیں۔ ان کے طنز کے تیروں کی زد میں مذہبی عقائد اور مسلمات، سیاسی، سماجی اور اخلاقی اقدار، فرد کے ظاہر و باطن کی ثنویت اور دوئی، انسان کا منافقانہ رویہ، مذہبی قائدین اور علما کے طریقۂ کار، مسلک و مذہب کی بنیاد پر تعصب کا پھیلتا کاروبار اور عالمی سطح پر موجود نسلی تعصبات؛ غرض یہ کہ ایسے سبھی موضوعات رہتے ہیں جو ان کی انسانی اقدار اور عالمی برادری کے تصور کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں، چند مثالیں دیکھیے:

سیاسی اور مذہبی قدروں پر طنز کی یہ کاٹ دیکھیے:

> میں ابو سے تنگ آ گئی ہوں، اسلام اور پاکستان کے نام پر نا تک زیادہ عرصہ نہیں چل سکتا۔ میرے لیے یہ دونوں الفاظ گالی بن چکے ہیں۔ میرا

---

51. ٹوٹا ہوا آدمی، ص: 44
52. مقدس جیل، ص: 205

بس چلے تو آج ہی گھر سے بھاگ جاؤں[53]

مذہبی مسلمات اور عقائد پر ان کے طنز کا انداز:

''میں انھیں بتاتا ہوں کہ مسلمان مرد کو صرف چار کی اجازت ہے صرف پیغمبر کو خود گیارہ کی اجازت تھی[54]

مسجد اور گرجے میں کیا فرق ہے؟

'ایک میں موسیقی گناہ ہے دوسرے میں ثواب'

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا[55]

یہ سب بکواس ہے۔ کالے تاریخ میں ہی نہیں اسلام میں بھی غلام رہے ہیں۔

'بلال حبشی کو تو اسلام نے بہت مرتبہ دیا تھا'

'ہاں موذن بنا دیا خلیفہ تو نہیں بنایا نا'

عورت کو صرف چہرہ، ہاتھ اور پاؤں ظاہر کرنے کا اجازت ہے، البتہ مردوں کو صرف ناف سے گھٹنوں تک چھپانے کا حکم ہے۔ خدا جانے یہ قانون کس نے بنایا ہے[56]

تہذیبی اقدار پر طنز:

'پاکستان میں کتوں کو ناپاک سمجھا جاتا ہے میرے والدین کہا کرتے تھے کہ اگر گھر میں کتا ہو تو رحمت کے فرشتے نہیں آتے'

'کتے تو خود انسان کے لیے رحمت کا فرشتہ ہوتے ہیں اور بہترین ساتھی'

53. جڑیں، شاخیں، پھل، مشمولہ زندگی میں خلا، ص: 19
54. ایضاً، ص: 23
55. ایضاً، ص: 32
56. مقدس جیل، ص: 185

'پاکستان میں کس قسم کے کتے ہوتے ہیں'
'گلیوں کے آوارہ کتے اور پاگل کتے'[57]

انسانوں کے منافقانہ رویے پر طنز:

نرسوں نے مجھے بتایا کہ وہ سعودی عرب میں تین مہینے رہنے کے بعد مسلمان ہو گیا تھا اور دو دفعہ شادی کر لی تھی۔ اسے شاید اسلام کی یہی چیز سب سے زیادہ پسند آئی تھی[58]

مذہبی رہنماؤں کے طریقۂ کار پر طنز:

میں نے کسی غیر مذہبی شخص کو لوگوں کے دروازے پر دستک دیتے نہیں دیکھا اور التجا کرتے نہیں سنا کہ تم مسجد یا گرجا یا مندر مت جاؤ۔ لیکن مذہب کے پیروکار اسے اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ ہر کس و ناکس کے دروازے پر دستک دے کر ہدایت کی تلقین کریں اور اگر لوگ ان کے منہ پر دروازہ بند کر دیں تو اداس ہو جائیں[59]

سیاسی اور مذہبی طنز:

......پاکستانیوں اور مسلمانوں کو الیکشن راس نہیں آتے کیوں کہ وہ ان کے مزاج کے خلاف ہیں۔ انھیں صدیوں سے جبر و تشدد اور ڈکٹیٹر شپ کی عادت پڑ گئی ہے۔ آقا اور غلام کا وہ واحد رشتہ ہے جس کے وہ عادی ہیں۔ چاہے کوئی عبداللہ ہو، عبدالرشید ہو غلام نبی ہو غلام رسول ہو، حکومت کا غلام ہو یا بیوی کا۔ انسانوں کی آزادی اور برابری ابھی اس قوم کی

57. ایک پاؤں میں زنجیر؛ مشمولہ زندگی میں خلا؛ ص: 36
58. مقدس جیل؛ ص: 214
59. نوح کے رشتہ دار؛ مشمولہ زندگی میں خلا؛ ص: 72

معاشرت اور سیاست کا حصہ نہیں بنی۔[60]

مسلکی تعصب پر طنز کا یہ انداز ملاحظہ فرمائیں:

'اگر ہمیں کوئی ایسا عالمِ دین مل جائے جس پر باقی علما نے کفر کا فتویٰ نہ لگایا ہو تو ہم اسے دس ہزار روپے دیں گے'

'چھ مہینے گزر گئے۔ پورے ملک میں سے ایک عالمِ دین تک کا نام موصول نہیں ہوا'۔[61]

عالمی سطح پر یوں تو نسلی تعصب کا زہر تقریباً سبھی قوموں میں سرایت کر گیا ہے لیکن سیاہ فاموں اور سفید فاموں کے درمیان تعصب کی یہ خلیج زیادہ گہری ہے۔ خالد سہیل ایک کمیٹڈ ادیب کی طرح سیاہ فاموں کے دوش بدوش نظر آتے ہیں ان کی ساری جنگ نسلی تعصب کے خاتمے کے لیے ہے اور یہ ایک خاص وجہ ہے کہ اس موضوع پر ان کا طنزیہ لہجہ زیادہ کاٹ دار اور موثر ہو جاتا ہے:

زہرا ہرسٹن ایک سیاہ فام امریکن تھی۔ وہ سرخ بتی پار کرتے ہوئے پکڑی گئی تو اس نے جج کے سامنے کہا:

'میں نے سفید فام لوگوں کو سبز بتی پر سڑک پار کرتے ہوئے دیکھا تو سمجھی کہ سرخ بتی کالوں کے لیے ہے'۔

پھر وہ انڈین لڑکا پانی کی طرف بڑھنے لگا۔

'او انڈین' ایک لڑکی چیخی

'تم اس میں نہیں نہا سکتے' دوسرا لڑکا بولا

'وہ کیوں' اس نے پوچھا

'تم انڈین ہو'

---

60. ٹوٹا ہوا آدمی، ص: 41-40

61. چنگاریاں؛ مشمولہ: دو کشتیوں میں سوار، ص: 16

'اور یہ بھی تو انڈین اوشن ہے' وہ لڑکا چیخا'[62]

تکنیک

تکنیک سے مراد وہ طریقہ ہے جس سے فن کار اپنے موضوع کو پیش کرتا ہے[63]

ارسطو کے اس قول کی روشنی میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ موضوع اور مواد کو خاص طریقے سے پیش کرنا اس کی تکنیک کہلاتا ہے۔ تکنیک اور ہیئت کے ضمن میں یہ نکتہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ہیئت کسی بھی تخلیق اور موضوع کو پیش کرنے کا ظاہری ڈھانچہ ہے مثلاً متعدد اصنافِ نثر و نظم ہیئت کے ذیل میں شمار کی جائیں گی۔ افسانہ، داستان، ناول، خاکہ، سفرنامہ، خودنوشت، مکاتیب اور رپورتاژ دراصل نثر کی مختلف ہیئتیں ہیں۔ تکنیک، ہیئت کے داخلی نظام کا ایک حصہ ہوتی ہے جیسے بیانیہ تکنیک، ڈرامائی تکنیک، مکالمے کی تکنیک، خود کلامی کی تکنیک، شعور کے رو کی تکنیک، خطوط کی تکنیک اور روزنامچہ کی تکنیک وغیرہ؛ ممتاز شیریں، افسانوی تکنیک کے بارے میں لکھتی ہیں:

> 'افسانے کی تعمیر میں جس طریقہ سے مواد ڈھلتا جاتا ہے، وہی تکنیک ہے ......ایک خاص مواد ایک خاص تکنیک میں ڈھل کر زیادہ موثر ہو جاتا ہے لیکن اسی مواد کے دوسری تکنیک میں ڈھل جانے سے سارا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ تکنیک کی اقسام کا نقشہ بنانا مشکل ہے[64]

تکنیک کے مذکورہ بالا اصولوں اور قسموں کی روشنی میں خالد سہیل کے افسانوں سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے یہاں افسانوں میں تکنیک کی رنگارنگی اور تنوع ہے۔ تکنیک میں انھوں نے مختلف تجربات کا ایک نگارخانہ سجا رکھا ہے اور اپنے افسانوں کے تخلیقی اظہار کے لیے متعدد تکنیک کا سہارا لیا ہے۔ یوں تو زیادہ تر افسانے بیانیہ تکنیک کی طرز میں ہیں لیکن ایسے

62. ریت کے محل؛ مشمولہ: زندگی میں خلا؛ ص: 104
63. ارسطو؛ بوطیقا؛ ترجمہ: عزیز احمد
64. ممتاز شیریں؛ معیار؛ ص: 19-17؛ بحوالہ: اردو افسانہ: روایت اور مسائل؛ مرتبہ: گوپی چند نارنگ؛ ص: 46

افسانوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے جو بیانیہ سے ہٹ کر دوسری تکنیک میں لکھے گئے۔اس سبھی تکنیک کو علاحدہ علاحدہ مثالوں سے واضح کرنا ایک مشکل اور تفصیل طلب امر ہے۔صرف افسانوں کے عناوین اوران کی تکنیک کی تفصیل پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

خالد سہیل کے یہاں بیانیہ تکنیک غالب رجحان کی حیثیت رکھتی ہے۔ دیگر افسانہ نگاروں کا بھی غالب طریقۂ اظہار یہی رہا ہے۔ بیانیہ کے علاوہ مکالماتی تکنیک میں بھی بہت سارے افسانے لکھے گئے،ایک تبصرہ نگار کے لفظوں میں:

> ......یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ اس کے زیادہ تر افسانے مکالماتی ہیں۔ عموماً دو کردار ایک دوسرے سے سوال جواب کرتے ہیں اور بین السطور میں افسانہ نگار اپنے نظریے اور پیغام کی ترسیل کا سامان فراہم کرتا جاتا ہے......اس کی ایک وجہ خالد کا ذریعۂ روزگار بھی ہوسکتا ہے......اس صورت حال سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ بہر حال فکر انگیز اور غور طلب ہوتا ہے۔[65]

'الجبرا یا جیومیٹری'، 'جزیرہ'، 'ریت کے محل'، 'ایک پاؤں میں زنجیر' اور 'کچے دھاگے' اسی مکالماتی تکنیک میں لکھے گئے افسانے ہیں۔

تخلیقی افکار کے اظہار کے لیے بیانیہ اور مکالماتی تکنیک کے علاوہ دیگر تکنیک کا بھی سہارا لیا گیا ہے مثال کے طور پر 'جڑیں، شاخیں، پھل' کی تکنیک بیانیہ سے قریب معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً وہ سفرنامے کی تکنیک میں ہے۔'زندگی میں خلا'فلیش بیک کی تکنیک میں، 'دو باپ' اور 'تاریخ کی چکی کے دو پاٹ' ڈرامائی تکنیک لیے ہوئے ہیں۔اسی طرح 'ذات کے ٹکڑے'، 'دو کشتیوں میں سوار' میں بیانیہ رنگ کے ساتھ ساتھ خودکلامی کی تکنیک برتی گئی ہے۔ مکالماتی تکنیک کے علاوہ خطوط بھی ذات کے نہاں خانوں میں اترنے اور لاشعور کی پرتوں کو کھولنے میں اہم کردار نبھاتے ہیں، خالد سہیل نے اس تکنیک سے بھی اپنی فکر کی ترجمانی کا کام لیا ہے۔' کھلے

---

65. زندگی میں خلا،ص:8

اور بند دروازے'، 'مسیحا کا کرب' اور 'تڑپ کا اکا' ایسے ہی افسانے ہیں جن میں خطوط کی مدد سے خالد سہیل نے کرداروں کی داخلی کیفیات کو اجاگر کیا ہے۔ بعض کہانیاں آپ بیتی کی تکنیک میں لکھی گئی ہیں جن میں 'دو پیروں والی ماں' اور 'دیواروں پر لٹکی تصویریں' شامل ہیں۔ 'کٹی ہوئی پتنگیں' علامتی تکنیک لیے ہوئے ہے اور خلیجی بحران کے پس منظر میں لکھی گئی کہانی 'امن کی دیوی' ڈائری اور رپورتاژ کی تکنیک میں لکھی گئی ہے۔ غرض یہ کہ خالد سہیل نے تکنیک کے معاملے میں خاصے تجربے کیے ہیں لیکن پھر بھی کہانی کا بیانیہ اور مکالماتی انداز ان کا خاص رجحان کہا جائے گا۔

افسانے کے ساتھ ساتھ ناولوں میں بھی خالد سہیل نے تکنیک کے کئی کامیاب تجربے کیے ہیں۔ 'ٹوٹا ہوا آدمی' خالد سہیل کا پہلا ناولٹ ہے جس میں ایک مہاجر کی نفسیاتی کیفیت پر کہانی کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے۔ بنیادی طور سے یہ ناولٹ بیانیہ تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ پاکستان کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان کناڈا میں مقیم اپنے چچا کے اصرار پر اپنے والدین کے ساتھ کناڈا کا رخ کرتا ہے اور وہاں مختلف مراحل سے گزرتا ہوا نفسیاتی تضاد کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی کہانی کو خالد سہیل نے بیانیہ تکنیک کا سہارا لے کر انتقام تک پہنچایا ہے لیکن ناول کے مطالعے کے دوران محسوس ہوتا ہے کہ صرف بیانیہ تکنیک کے بل بوتے یہ ناول مکمل نہیں ہوا۔ ممتاز شیریں نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ......بعض تکنیکیں بنے بنائے سانچے کی طرح ہوتی ہیں لیکن کئی تکنیکوں کی حدیں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں اور افسانے میں دو قسم کی تکنیکوں کا امتزاج ہو جاتا ہے اور یہ ملی جلی تکنیک بذاتِ خود ایک الگ تکنیک بن جاتی ہے۔[66]

یہی صورت حال اس ناول میں نظر آتی ہے۔ یہ ناول بھی مختلف تکنیکوں کے سانچے میں ڈھل کر آگے بڑھتا ہے۔ ناول کا آغاز بیانیہ تکنیک سے ہوتا ہے اور درمیان میں بعض مقامات پر

66. ممتاز شیریں: معیار، ص: 19-17، بحوالہ: اردو افسانہ: روایت اور مسائل، مرتبہ: گوپی چند نارنگ، ص: 47

جب شہزاد ذہنی اور نفسیاتی الجھاو کا شکار ہوتا ہے تو شعور کی رو کی تکنیک کے سہارے کہانی میں رفتار پیدا ہوتی ہے، کچھ مقامات ایسے بھی آئے ہیں جہاں فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ کہانی میں رفتار پیدا کرنے کے لیے کہیں کہیں خطوط کی تکنیک بھی استعمال ہوئی ہے۔ الغرض 'ٹوٹا ہوا آدمی' کسی ایک مخصوص تکنیک میں محدود نہ ہو کر مختلف تکنیکوں کے امتزاج سے اپنا ڈھانچہ بنانے میں کامیاب ہوا ہے۔ تکنیک کے اس امتزاج سے خالد سہیل کی قوتِ مشاہدہ اور باریک بینی کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ناول کی تکنیک دراصل اپنے مرکزی کردار کی نفسیات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ جس طرح شہزاد باغی، لاابالی اور روایت شکن تھا، اس کی سیماب مزاجی اور نفسیاتی الجھنیں اسے ایک مرکز پر ٹھہرنے نہ دیتی تھیں، ناول بھی مختلف النوع تکنیکوں کے امتزاج سے مکمل ہوا ہے۔ تکنیک کی رنگارنگی اور تنوع شہزاد کے مزاج کا استعارہ ہے۔

اس ناول میں ایک اور تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے ہر حصے کا عنوان غالبؔ کے مختلف مصرعوں سے آراستہ ہے۔ مصرعے کے مفہوم سے یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں رہ جاتا کہ ناول کا حصۂ مذکور کس قسم کے مسائل کو موضوع بحث بنائے گا۔ یہ طریقہ جہاں شہزاد کے 'دیوانِ غالبؔ' کے تئیں اشتیاق اور دیوانگی کو ظاہر کرتا ہے وہیں خالد سہیل کی غالبؔ کے تئیں عقیدت مندی کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔ ناول کی زبان تشبیہات واستعارات اور علامتوں سے بے نیاز ہے۔ پورے ناول میں ایک آدھ تشبیہ اور استعارے کا ہی استعمال ہوا ہے لیکن ان تشبیہوں میں اچھوتاپن، جدت، تازگی اور زندگی کی حرارت موجود ہے، محض دو مثالیں دیکھیے:

> تمھارے جسم کی منفرد خوشبو ہے، مٹی کی خوشبو کی طرح، ایسی مٹی جس پر پانی چھڑکا گیا ہو[67]

> ایسی خاموشی جو حاملہ تھی لیکن کوئی نہ جانتا تھا کہ اس دفعہ اس کی کوکھ سے گلاب کا پھول نمودار ہوگا یا سانپ[68]

---

67. ٹوٹا ہوا آدمی: ص: 47

68. ٹوٹا ہوا آدمی: ص: 164

مختصراً یہ کہنا چاہیے کہ 'ٹوٹا ہوا آدمی' کی تکنیک ایک ملی جلی تکنیک ہے جس میں بیانیہ تکنیک غالب عنصر کی حیثیت سے موجود ہے اور اندازِ بیان سیدھا سادا اور ابلاغ کی قوتوں سے مالا مال ہے۔

خالد سہیل کے دوسرے ناولٹ 'مقدس جیل' کی پیش کش کا انداز رپورتاژ سے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ورانیکا نے اپنی زندگی کے تجربات و مشاہدات اور ذہنی ونفسیاتی کیفیات کو مختلف اوقات میں ترتیب دیا ہے اور پھر انھیں ایک کہانی کے روپ میں پیش کر دیا ہے۔ یہ ایک اہم سبب ہے کہ ناولٹ کے پلاٹ میں کہیں کوئی پیچیدگی اور الجھاو نہیں ہے۔ کہانی ایک خاص انداز سے شروع ہو کر نو مہینے بعد اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔ ناول کی پیش کش کا یہ انداز تکنیکی نقطۂ نظر سے بیانیہ تکنیک کے ذیل میں آتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں خود کلامی اور مکالمہ آرائی کی تکنیک کا بھی استعمال کرتے ہوئے کہانی کو رفتار دی گئی ہے۔ یوں بھی احساس ہوتا ہے کہ راوی نے آپ بیتی کا انداز اپنایا ہے۔ اسلوب اور زبان و بیان کے اعتبار سے اس ناول کا طنزیہ لب ولہجہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ فکری جائزے میں ان تمام عبارتوں کو بطور مثال پیش کیا جا چکا ہے جو خالد سہیل کے فکری جہات کی عکاسی کرتی ہیں۔ خالد سہیل کا اندازِ تحریر ہر جگہ سیدھا سادا اور رواں اسلوب کے دائرے میں آتا ہے۔ ان کے یہاں زبان کی رنگینی نہیں ہوتی۔ اسی لیے بعض نقادوں نے ان کی تحریر پر یہ رائے دی کہ ان کی تحریریں سادہ تو ہوتی ہیں لیکن پرکاری سے عاری ہوتی ہیں۔ وہ تشبیہات و استعارات کے استعمال میں بھی تکلف اور احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ ان کی توجہ زبان کی آرائش سے زیادہ خیالات کی ترسیل پر رہتی ہے۔

'دریا کے اس پار' خالد سہیل کا تیسرا ناول ہے۔ انھوں نے اس ناول کو ایک نئے طرز میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ یوں تو 'ٹوٹا ہوا آدمی' اور 'مقدس جیل' میں تکنیک کے کئی رنگ نظر آئے تھے۔ باوجود اس کے کہ ان ناولوں میں موضوعات کی سطح پر جدت اور تازگی نمایاں تھی لیکن تکنیک کی سطح پر روایتی طرز کو ہی برتنے کی کوشش کی گئی تھی۔ 'دریا کے اس پار' کا امتیاز یہ ہے کہ ناول نگار نے فنی چابک دستی اور مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے اسلوب اور طرزِ ادا میں انفرادیت پیدا

کرنے کی طرف پیش قدمی کی ہے۔ ناول نگار نے واقعات اور کردار کی مختلف جہتوں کو رواں دواں نثر میں تحریر کیا ہے۔ 'ٹوٹا ہوا آدمی' کی طرح یہاں غالب کے مصرعے تو نہیں ہیں لیکن مختلف حصوں کی عنوان بندی کی وجہ سے کہانی کا تسلسل باقی رہتا ہے اور کہانی کے بارے میں دلچسپی بنی رہتی ہے۔ ظہیر انور نے خالد سہیل کے اس ناول کے اسلوب پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

......کہیں کہیں واقعتاً شعریت اور ڈرامائیت پیدا ہوگئی ہے۔ رواں نثر اور شعریت سے بھرپور اسلوب میں انگریزی ناولیں، یہاں تک کہ Indo Anglican ناول نگاروں کی تحریریں منصوبہ بند طرز پر سامنے آچکی ہیں۔ خالد سہیل زبان اور اسلوب پر مزید کچھ توجہ صرف کرتے تو یہ ناولٹ اپنے اجتہادی رویے اور منفرد بیانیہ کے لحاظ سے اور بھی پرکشش اور پرتجسس ہوتا۔ یوں بھی مختلف جملوں کو مختلف سطروں اور بحروں میں لکھ کر ناول نگار نے نہ صرف زبان کے ساتھ آزادی روا رکھی ہے بلکہ ناولٹ کو صوری حسن سے بھی ہم کنار کیا ہے اور یہ آزادی ناولٹ کے مرکزی کردار کی نفسیات سے حد درجہ مطابقت رکھتی ہے[69]

اس کے علاوہ ناول میں مختلف علاقائی تہذیبی اثرات کے حامل لفظوں کی موجودگی اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ خالد سہیل نے پختون تہذیب اور اس کی رنگارنگی کو بہت قریب سے دیکھا پرکھا اور سمجھا ہے۔ اس کی مثال ناول میں یوں ملتی ہے کہ 'مورے' اور 'متوزہ' جیسے الفاظ خالص پختون تہذیب کی لفظیات ہیں اور مخصوص تہذیبی معانی کے حامل ہیں۔ تکنیک کے نقطۂ نظر سے یہ ناول بھی مختلف تکنیکوں کا آمیزہ معلوم ہوتا ہے۔ ناول کی ابتدا فلیش بیک اور شعور کی رو کے امتزاج سے ہوتی ہے:

وہ ایک رات

صدیوں پہ بھاری تھی

---

69. دریا کے اس پار، ص: 16

اس رات
مجھے یوں محسوس ہوا تھا
جیسے میں نے
حالات کے چڑھتے دریا میں
چھلانگ لگا دی ہو
اور
گہرے پانیوں کی
تند و تیز لہروں کے ساتھ
بہتی چلی جا رہی ہوں[70]

شعور کی رو کی ایک جھلک ملاحظہ فرمایئے:

اس رات میں
گھنٹوں ٹورنٹو کی گلیوں میں
بے مقصد اور بے منزل
ڈرائیو کرتی رہی
اور پھر وہ گلیاں
غیر محسوس طریقے سے
ماضی کی ان گلیوں سے جا ملی تھیں
جہاں میں نے
بچپن اور جوانی کے دن گزارے تھے[71]

مذکورہ بالا مثالوں کے باوجود اس ناول کی تکنیک بیانیہ کے ذیل میں آئے گی کیوں کہ وہی

---

70. دریا کے اس پار؛ ص: 21
71. دریا کے اس پار؛ ص: 27

اس کی بنیادی تکنیک ہے۔ حالاں کہ کہیں خودکلامی اور کہیں آپ بیتی کی تکنیک بھی برتی گئی ہے۔ غرض یہ کہ اس ناول میں بھی خالد سہیل نے مواد اور موضوع کو تکنیک پر فوقیت دی ہے اور موضوع کو پیش کرنے کے لیے مختلف تکنیکوں کو ایک ہی ناول میں برتنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

●●

حاصل مطالعہ

خالد سہیل کے اسلاف کشمیری النسل تھے۔صدیوں پہلے وہ اس جنت ارضی کو خیر باد کہہ کے پنجاب کے میدانی اور زرخیز علاقے میں آباد ہو گئے تھے۔ جب 1947ء میں تقسیمِ ملک کا فساد شروع ہوا تو خالد سہیل کے اہلِ خاندان بھی امرتسر سے لاہور میں آبسے۔ یہیں جولائی 1952ء میں ان کی پیدائش ہوئی۔ ان کے خاندان میں مذہبی اور روایتی قدروں کے احترام کے ساتھ ساتھ سائنسی اور منطقی رویوں سے بھی لگاؤ اور وابستگی کی مضبوط روایت موجود تھی۔ خالد سہیل کے دادا ایک لبرل اور آزاد خیال انسان، دادی حق گو اور بے باک خاتون، چچا عارف عبدالمتین مشہور ترقی پسند شاعر اور انسانیت دوست آدمی تھے۔ ان کے والد ریاضی کے استاد اور سیکولر نظریے کے حامی شخص تھے، خالد سہیل کی نانی ایک مضبوط ارادے کی مالک اور سحر آمیز شخصیت کی ملکہ تھیں، چچا عارف عبدالمتین کی شخصیت و کردار نے خالد سہیل کی ذہنی آبیاری اور ادب و فلسفے سے لگاؤ اور دلچسپی پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کے علاوہ ان کی شخصیت کو بال و پر عطا کرنے میں باقی شخصیتوں اور خاندانی تہذیب و شرافت کا خاصا عمل دخل رہا۔

خالد سہیل کے بچپن کے ایام صوبۂ سرحد میں بسر ہوئے۔ چونکہ ان کے گورنمنٹ کالج، کوہاٹ میں لکچرر مقرر ہو گئے تھے اس لیے انھیں پاکستان کے سرحدی علاقے میں بود و باش کرنے کا موقع ملا۔ برسوں بعد جب انھوں نے ادب کو تخلیقی اظہار کے طور پر اپنایا تو بچپن کے ان تجربات کو 'دریا کے اس پار' میں منعکس کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ خالد سہیل کی ابتدائی تعلیم کا سلسلہ سینٹ جوزف اسکول سے شروع ہوا۔ ہائی اسکول کا امتحان پشاور سے پاس کرنے کے

بعد اسی شہر کے مختلف کالجوں میں زیر تعلیم رہے اور بالآخر 1974ء میں ایم۔بی۔بی۔ایس کی ڈگری حاصل کر ڈاکٹر بن گئے۔

1976ء میں خالد سہیل نے پاکستان کو خیر باد کہہ دیا اور ایران چلے گئے۔ایران میں ڈیڑھ برس قیام کرنے کے بعد وہ کناڈا منتقل ہو گئے اور تاہنوز اسی ملک کے ایک شہر وھٹبی میں مستقل طور سے سکونت پذیر ہیں۔اپنے ذاتی کلینک Creative Psychotherapy Clinic میں نفسیاتی مریضوں کا علاج کرتے ہیں اور فکر وخیال کے تخلیقی اظہار کے لیے مضامین، افسانے اور ناول لکھتے رہتے ہیں۔خالد سہیل ایک زود نویس اور بسیار نویس قلم کار ہیں۔ایک افسانے میں انھوں نے لکھا ہے:

> مہاجروں کے بچے غیر معمولی ہوتے ہیں یا تو فنکار بنتے ہیں یا ذہنی خلل کا
> شکار ہو جاتے ہیں
> کیا مطلب؟
> انھیں ایک طرف تو ماضی کی روایات اور اقدار کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے اور
> دوسری طرف نئے تقاضوں اور مسائل کو گلے لگانا پڑتا ہے جو کامیاب
> ہو جائیں وہ فنکار اور جو ناکام ہو جائیں وہ دیوانے بن جاتے ہیں[72]

خالد سہیل ایک مہاجر خاندان کے فرد ہیں۔ان کے خاندان کا جو سفر کشمیر کی وادی سے شروع ہوا تھا وہ مختلف مراحل سے گزرتا ہوا کناڈا تک پہنچا ہے۔نقلِ مکانی کے اس طویل سفر میں خالد سہیل نے اپنے غیر معمولی ہونے کا ثبوت مختلف موضوعات پر کتابیں تخلیق کر کے دے دیا ہے۔فی الحال وہ تیس اردو کتابوں کے مصنف یا مترجم ہیں، اور اس سے کہیں زیادہ انگریزی میں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔آخر یہ غیر معمولی پن اور دیوانگی نہیں تو کیا ہے؟ بقول شخصے 'جتنی کتابیں سہیل نے تخلیق کی ہیں، اتنے خطوط ہم نے نہیں لکھے'[73]

72. زندگی میں خلا؛ ص: 16
73. ماہنامہ شاعر؛ ص: 15

جہاں تک اردو فکشن کی کائنات کی بات ہے تو خالد سہیل نے تین افسانوی مجموعے اور تین ناولٹ تخلیق کیے ہیں۔ انھوں نے ان ناولوں اور افسانوں میں انسانی برادری کے دکھ درد کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور دنیا کو درپیش مختلف نازک مسائل سے اپنے افسانوں کا پلاٹ تیار کیا ہے۔ ان میں نسلی تعصب، جنسی تعصب، حقوقِ انسانی، عورتوں کے حقوق اور مسائل، فرد کی ذہنی اور فکری آزادی، انسانی مساوات اور امن عالم جیسے موضوعات کو خاص طور سے برتا ہے۔

'ٹوٹا ہوا آدمی' مشرق کے نوجوانوں کے بہتر مستقبل کی تلاش میں مغربی ممالک کی جانب ہجرت کرنے کی کہانی ہے۔ ہجرت کے دوران اور بعد میں پیش آنے والے واقعات سے مہاجرین کی شخصیت کس قسم کے شکست وریخت کے عمل سے گزرتی ہے کہ اپنا ذہنی توازن کھودیتی ہے، اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ ناول پرانے اور روایتی رشتوں کے ٹوٹنے اور انسان کے اپنی ذات اور کائنات سے نئے رشتے جوڑنے کی کہانی ہے۔ 'مقدس جیل' میں ایک مغربی عورت کی زبانی سعودی عرب کی زندگی کے شب وروز کی کہانی ہے جو بغرضِ ملازمت سعودی عرب کا رخ کرتی ہے اور وہاں کے سماج میں انسانی حقوق اور عورتوں کے حقوق کی پامالی اور سماج و مذہب کے تضادات کو راوی کی حیثیت سے بیان کرتی ہے۔ کہانی کا موضوع ارضِ مقدس کی سماجی، مذہبی اور تہذیبی زندگی کی تصویرکشی ہے۔ 'دریا کے اس پار' میں ایک تعلیم یافتہ پختون لڑکی کی خودمختاری، آزادی اور حقِ انتخاب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پختون سماج روایتی، سخت اور بے لوچ ضابطوں میں یقین رکھنے والا سماج ہے اس ماحول کی پروردہ لڑکی آزادی کی خاطر جب علم بغاوت بلند کرتی ہے تو اسے کن صبر آزما، حوصلہ شکن لمحوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کہانی میں ایسے ہی لمحوں کو قید کیا گیا ہے۔ یہ ناول ایسی عورت کی کہانی ہے جو عزتِ نفس، خوداعتمادی اور آزادی کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتی۔

ناول کے علاوہ افسانوں میں بھی خالد سہیل نے اپنی فکری روش اور تنقیدی جہت کو عالمی اور عصری مسائل کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔ جن موضوعات کو بھی قلم کی گرفت میں لیا ہے ان میں بعض کا تعلق مہاجرین، تارکین وطن اور ہجرت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے گوناگوں

مسائل سے ہے۔ اس کے علاوہ اقلیت کے مسائل ہوں یا نسلی تعصب کے، عورتوں کی آزادی اور خودمختاری کا مسئلہ ہو یا ان کی مظلومی و مجبوری کا۔ دنیا میں امن و امان قائم کرنے والوں کی جدوجہد کا مسئلہ ہو یا اس راہ میں کانٹے بچھانے والوں کی ریشہ دوانیوں، سازشوں اور سیاسی مصلحتوں کا، حقوق انسانی اور فرد کی آزادی کا مسئلہ ہو یا مختلف تعصبات کی بنیاد پر حاشیے پر کھڑے عوام کا؛ تمام مسائل پر خالد سہیل نے اپنے مخصوص، سیکولر، ترقی پسند، مثبت اور غیر متعصبانہ انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ان کی روح مظلوم کی حالت زار دیکھ کر تڑپ اٹھتی ہے، وہ مظلوموں کے حامی اور ظالموں اور غاصبوں کی چیرہ دستیوں کے خلاف ہیں۔

خالد سہیل کی کہانیوں میں موضوعات کا تنوع موجود ہے۔ جنگ، سیاہ فاموں کی جدوجہد، گے اور لیسبین کے حقوق، عورتوں کے مسائل، اقلیتوں کے مسائل، مغربی طرزِ حیات اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نفسیاتی کشاکش کے حالات، مغرب کی کھوکھلی اور ظاہر پرستی پر مبنی زندگی، سماج میں موجود مختلف افراد کی نفسیاتی کہانی، سیاسی احتجاج، تیسری دنیا کے مسائل، ایڈز اور جنسی مسائل وغیرہ بے شمار موضوعات پر خالد سہیل نے قلم اٹھایا اور اردو افسانے کے قاری کو عصری اور عالمی مسائل سے روبرو کیا۔

ناولوں اور افسانوں کے موضوعات کی رنگا رنگ دنیا میں خالد سہیل کے فکری نقوش کچھ اس طرح بنتے ہیں کہ زندگی کے بارے میں ان کی فکر مذہبی، اسلامی اور روحانی اقدار کے بجائے انسانی اقدار کی حامی بن گئی۔ ان کے خیال میں جو قدر تمام انسانوں کو ایک رشتے میں پروتی ہے وہ انسانیت کی اعلیٰ ترین قدر ہے۔ افسانوں اور ناولوں کے مختلف موضوعات کی پیش کش کے مطابق وہ زندگی کا ایک مثبت، روشن اور آزاد تصور رکھتے ہیں۔ ان کے فکری نظام میں ایک ایسے سماج کی تشکیل کا ڈھانچہ بنتا ہے جو استحصال کی لعنت سے پاک ہو اور فرد و قوم کی آزادی اور حقوق کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہو۔ وہ فرد اور خاص طور سے عورتوں کی آزادی اور خودمختاری کے قائل ہیں۔ اس کی پشت پر یہ خیال کارفرما ہے کہ عورتیں خواہ مشرقی ہوں یا مغربی، ہر جگہ استحصال اور تعصب کا شکار

ہیں اور دوسرے درجے کی شہری تسلیم کی جاتی ہیں۔ اس بنا پر وہ عورتوں کی آزادی (مذہبی، معاشی، سیاسی اور جنسی) کے قائل ہیں، عورتوں کی آزادی کا جذبہ کبھی کبھی اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ حدِ اعتدال سے تجاوز کر رہے ہیں اور ان کے فکر کی کڑیاں عورتوں کے حقوق کی خاطر دنیا میں متحرک مختلف تنظیموں اور ان کے فکر و فلسفے کی دھوپ چھاؤں معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ مزید تسلیم کرتے ہیں کہ ساری دنیا میں عورتوں کے مسائل یکساں نوعیت کے حامل نہیں ہیں، دنیا کے مختلف ممالک میں عورتوں کے مسائل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور ان مسائل کے حل کی بھی جداگانہ طریقے پر کوشش ہونی چاہیے ورنہ غلط نتائج تک پہنچنے کے قوی امکانات ہیں۔

خالد سہیل کی فکر کا بیش تر حصہ مغربی طرزِ زندگی میں پرورش پا کر جوان ہوا ہے چنانچہ وہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کا خواب بنتے رہتے ہیں جہاں نہ صرف قانونی اور سیاسی طور سے مقامی اور پردیسی باشندوں میں کوئی امتیاز نہ ہو بلکہ اس کا عملی اظہار بھی دیکھنے کو ملے۔ مہاجرین نئی تہذیب اور نئے معاشرتی رویوں سے خائف نہ رہیں بلکہ اپنی امتیازی اقدار کو باقی رکھتے ہوئے نئے معاشرے کی قدروں کو اپنی شخصیت میں جذب کرنے کی جانب پیش قدمی کریں۔ خالد سہیل کا ماننا ہے کہ سیاسی اور معاشی نابرابری کی بنیاد پر کوئی معاشرہ صالح قدروں کی پرورش نہیں کر سکتا۔ جنوبی افریقہ کے پس منظر میں لکھے گئے افسانے اس کا ثبوت ہیں۔ دنیا میں امن اور مساوات کی بارش اسی وقت تک ہو سکتی ہے اور یہ زندگی اپنے باسیوں کے لیے اسی وقت جنت بن سکتی ہے جب تک سارا معاشرہ استحصال، رنگ و نسل کے امتیاز اور جنسی تفریق کے جذبے سے بے نیاز نہ ہو جائے۔ جب تک انسانوں میں سیاسی، معاشی، اقتصادی اور جنسی نابرابری کا احساس باقی رہے گا ایک پرامن اور صالح معاشرے کی تکمیل کا خواب تشنۂ تکمیل رہے گا۔

اپنے فکری رویوں کو قاری تک پہنچانے کے لیے خالد سہیل نے تکنیک کی سطح پر بھی کئی تجربے کیے ہیں۔ ناولوں میں تو بیانیہ اور رپورتاژ کی تکنیک غالب ہے لیکن بعض مقامات پر خطوط اور شعور کی رو کو برتتے ہوئے کہانی کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ تکنیک کے زیادہ تجربے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں افسانوں کی تکنیک میں رنگارنگی اور

تنوع ہے۔ تکنیک میں انھوں نے مختلف تجربات کا نگارخانہ سجا رکھا ہے۔ بیانیہ تکنیک کے علاوہ مکالماتی، سفرنامے، فلیش بیک، ڈرامائی، خودکلامی، خطوط، آپ بیتی، علامتی اور رپورتاژ کی تکنیکوں کو خالد سہیل نے فکری اور تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ گویا تکنیک کے نقطۂ نظر سے انھوں نے خود کو کسی ایک خانے میں محدود نہیں رکھا ہے پھر بھی بیانیہ اور مکالماتی تکنیک ان کی مخصوص تکنیک کہی جاسکتی ہے۔

اسلوب اور اندازِ بیان کے باب میں خالد سہیل سیدھے سادے اسلوب کی پیروی کرتے ہیں تا کہ قاری اور تخلیق کار کے درمیان ابلاغ کی خلیجیں حائل نہ ہوسکیں۔ ان کا اندازِ تحریر سیدھا سادا اور رواں اسلوب کے دائرے میں آتا ہے۔ خالد سہیل کے ہاں زبان کی رنگینی اور چاشنی نہیں ہوتی، اسی لیے بعض نقادوں نے ان کی تحریر پر یہ رائے دی کہ ان کی تحریریں سادہ تو ہوتی ہیں لیکن پرکاری سے خالی ہوتی ہیں۔ وہ تشبیہات واستعارات کے استعمال میں تکلف اور احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ ان کی توجہ زبان کی آرائش سے زیادہ فکر وخیال کی ترسیل پر رہتی ہے۔ اس کے باوجود بعض مقامات پر زبان وبیان کی خوبیوں، محاوروں اور تشبیہوں کے اچھوتے استعمال سے قاری کے ذہن کو کریدنے، مسرت وانبساط کی فراہمی کے ساتھ ساتھ فکر وخیال کی نئی نئی وادیوں میں لے جانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور قاری لفظ ومعنی کی ایک نئی دنیا سے متعارف ہوتا ہے۔ یہ محاورے، جملے اور تشبیہیں جدت اور تازگی کی خوبیوں سے مالا مال نظر آتے ہیں، یہ حسن اس وقت اور بھی دوبالا ہوجاتا ہے جب خالد سہیل اس میں طنزیہ عناصر کی کاٹ شامل کردیتے ہیں۔ کہیں کہیں فلسفیانہ خیالات کی آمیزش سے بھی سیدھے سادے اور سپاٹ اسلوب کی بے کیفی اور بے رنگی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے فلسفیانہ خیالات میں زندگی کی حرارت اور تجربے کی گرمی اور صداقت موجود ہوتی ہے جو قاری کے دل ودماغ میں فکر وخیال کی نئی نئی کاشت تیار کرنے میں معاون ہوتی ہے۔

غرض یہ کہ خالد سہیل کے افسانوں اور ناولوں میں موضوعات، فکر، اسلوب، اندازِ بیان اور تکنیک کی سطح پر تنوع اور کثیر رنگی کے عناصر کارفرما نظر آتے ہیں۔ اپنی افسانوی کائنات کے

ذریعہ خالد سہیل نے اردو قارئین کو امکانات کے نئے جہانوں کی سیر کرائی۔ جن میں مہاجرین اور ہجرت، مغربی طرزِ زندگی کی عکاسی، نفسیاتی تصادم اور کشاکش، عالمی سیاست، پہلی اور تیسری دنیا کے افراد کی محرومیاں اور مجبوریاں، عورتوں، بچوں، اقلیتوں اور سیاہ فاموں کے مسائل وغیرہ موضوعات کو انھوں نے گویائی اور زبان عطا کی۔ فرد کو آزادی اور خود مختاری کے خواب دکھائے، دنیا کو امن کے ساتھ زندگی بسر کرنے اور اقلیتوں، مظلوموں اور عورتوں کے حقوق کی آواز بلند کی۔ اسلوب اور اندازِ بیان میں طنزیہ رنگ کو فروغ دیا۔ جب بھی اردو کے قاری کو عالمی مسائل، مغربی طرزِ حیات، مہاجرین اور اقلیت کے مسائل سے آگہی حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئے گی خالد سہیل کی تحریریں اسے مایوس نہیں کریں گی۔

●●

کتابیات

بنیادی ماخذ

خالد سہیل، ٹوٹا ہوا آدمی، کریئیٹو لنکس، کنیڈا، 1989

خالد سہیل، دریا کے اس پار، کریئیٹو لنکس، کنیڈا، 1997

خالد سہیل، دو کشتیوں میں سوار، کریئیٹو لنکس، کنیڈا، 1994

خالد سہیل، دھرتی ماں اداس ہے، کریئیٹو لنکس، کنیڈا، 1998

خالد سہیل، زندگی میں خلا، اردو انٹرنیشنل پبلشرز، کنیڈا، 1987

خالد سہیل، سچ اپنا اپنا، دارالشعور پبلشرز، پاکستان، 2009

ثانوی ماخذ

جگدیش چندر ودھاون، منٹو نامہ، جواہر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی، 1989

خالد سہیل، اپنا قاتل، مشعل بکس پبلشرز، کنیڈا، 2003

خالد سہیل، القاعدہ امریکہ اور پاکستان، 2010

خالد سہیل، امن کی دیوی، گورا پبلشرز، پاکستان، 1992

خالد سہیل، انفرادی اور معاشرتی نفسیات، سنگِ میل پبلشرز، پاکستان، 1991

خالد سہیل، ایک باپ کی اولاد، کریٹیولنکس، کنیڈا

خالد سہیل، آزاد فضائیں، گورا پبلشرز، پاکستان، 1993

خالد سہیل، بھگوان۔ایمان۔انسان، کریٹیولنکس، کنیڈا، 1988

خالد سہیل، پگڈنڈیوں پہ چلنے والے مسافر، کریٹیولنکس، کنیڈا، 1996

خالد سہیل، تلاش، اردو انٹرنیشنل پبلشرز، کنیڈا، 1986

خالد سہیل، خدا، مذہب اور ہیومن ازم، درویشوں کا ڈیرا، کنیڈا، 2005

خالد سہیل، سماجی تبدیلی، ارتقا یا انقلاب؟؛ سٹی بک پبلشرز، کراچی 2011

خالد سہیل، سمندر اور جزیرے، درویشوں کا ڈیرا، کنیڈا، 2006

خالد سہیل، شائزوفرینیا، کریٹیولنکس، کنیڈا، 1998

خالد سہیل، کالے جسموں کی ریاضت، انشا پبلشرز، کلکتہ، 1990

خالد سہیل، مذہب، سائنس نفسیات، کریٹیولنکس، کنیڈا، 1998

خالد سہیل، مغربی عورت، ادب اور زندگی، کریٹیولنکس، کنیڈا، 1988

خالد سہیل، میرے قبیلے کے لوگ، کریٹیولنکس، کنیڈا، 1998

خالد سہیل، ورثہ، گورا پبلشرز، پاکستان، 1993

خالد سہیل، ہر دور میں مصلوب، کلکتہ، انڈیا

سلام سندیلوی، ادب کا تنقیدی مطالعہ، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، 1986

شہزاد منظر، جدید اردو افسانہ، عاکف بک ڈپو، نئی دہلی

عاشور کاظمی، بیسویں صدی کے اردو نثر نگار مغربی دنیا میں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ، روایت اور مسائل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2000

فوزیہ اسلم، جدید اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2006

وارث علوی، جدید افسانہ اور اس کے مسائل، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، 1990
وقار عظیم، فن افسانہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1985

رسائل

عصری ادب، سہ ماہی، 1987
ماہنامہ شاعر، اگست 2006

ویب سائٹس

www.drsohail.com
www.old.drsohail.com
www.familyofheart.com

●●●

Khalid Sohail
Fan Aur Fankar

[Criticism]

By

Shabana Khatoon

خالد سہیل ایک کامیاب ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ادب کے میدان میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ ان کتابوں میں شاعری کے تین مجموعے، افسانوں کے چار مجموعے اور تین ناولٹ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مضامین اور انٹرویوز کے موضوع پر تین کتابیں، عالمی سیاست کے موضوع پر تین کتابیں، فلسفہ اور نفسیات کے موضوع پر چھ کتابیں اور عالمی ادب سے متعلق ایک کتاب منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کی خودنوشت سوانح بھی شائع ہو چکی ہے۔ انھوں نے اس کے علاوہ مختلف ادبیات اور سیاست سے متعلق چھ کتابیں ترجمہ کرکے بھی اردو والوں کی خدمت میں پیش کی ہیں اس طور پر وہ تیس کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ مطبوعہ کتابوں کے علاوہ افسانے اور شاعری کے دو آڈیو کیسٹ بھی بازار میں دستیاب ہیں۔ موضوعات کے تنوع سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خالد سہیل شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، مترجم، فلسفی اور مضمون نگار ہونے کے ساتھ تازہ کار تخلیق کار ہیں۔ ان کا تخلیقی سفر فکری تعمق سے عبارت ہے۔

خالد سہیل معاصر ادب کا اہم نام ہے۔ جس نے ہندو پاک کے باہر کی دنیا میں رہتے ہوئے بھی اردو کا چراغ جلائے رکھا ہے۔ اس طرح کے اور لوگ بھی ہیں ان پر لکھنا اور وہ بھی بصورت کتاب ——— کارے دارد ——— اس مرحلے کو محترمہ شبانہ خاتون نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ عبور کیا ہے۔ یہ ان کی پہلی تصنیف ہے لیکن اس میں بھی ایسے مقامات آتے ہیں جہاں ان کی دقت نظری اور تجزیاتی نقطۂ نظر روشن ہوتا ہے اور وہ قاری سے داد تحسین وصول کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

(ناشر)

تعارف

نام:

شبانہ خاتون

والدین:

عظیم الدین، ساجدہ

پیدائش:

14 جولائی 1975، بمقام مئو ناتھ بھنجن، یو پی

تعلیم:

پی ایچ ڈی (جاری) جے این یو، دہلی

ایم فل، جے این یو، دہلی

ایم اے، پوروانچل یونیورسٹی، جونپور، یو پی

موبائل:

+91-9927659400

ای میل:

shabanajnu@gmail.com

پتہ:

محلہ دمن پورہ (شیخ) مئو ناتھ بھنجن، یو پی

HALQA-E-ADAB-O-SAQAFAT

Shaikh Damun Pura, Mau (U.P.) India